جولائی۔ستمبر ۲۰۱۱ء

اردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلہ

سہ ماہی

الاقرباءؑ

اسلام آباد

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۴ شمارہ نمبر ۳ — جولائی۔ستمبر ۲۰۱۱ء

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۲۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد (پاکستان)

Ph.051-4442686 — Fax 051-2221670

website: www.alaqreba.com

E-mail: alaqreba@hotmail.com

بیرون ملک معاونین خصوصی

بیرسٹر سلیم قریشی

2-A Barclay Chamber, Barclay Road, Leytonstone
London, E-11. 3 DG (U.K.)
Phone (0208)5582289, Fax (0208)5583849
Email: Qureshi@ss/life .co.uk

پروفیسر محمد اویس جعفری

3202, 140th street, SE
Mill Creek WA 98012-4677 (USA)
Phone: (001) 425-385-8666
E-mail: Jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ	۲۰۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۸۰۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک)	۹ / ڈالر /۷ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۳۶ / ڈالر /۳۶ پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	جولائی۔ستمبر ۲۰۱۱ء
طابع	ضیاء پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر	سیّد ناصر الدین

مندرجات

گوشۂ نسائی ادب

خصوصی گوشہ

نعت ۔ منقبت

غزل

نظم

رباعی ۔ قطعہ

پاکستان میں تعلیم و تحقیق کی شکست و ریخت

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اس عالمگیر حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ البتہ تاریخ ہی سے ثابت ہے کہ دہرائے جانے کے اس عمل میں یکسانیت نہیں بلکہ یہ عمل گوناں گوں اور متنوع ہے۔ ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی سفاکانہ تباہی تاریخ کا سیہ ترین باب ہے۔ قطع نظر دیگر انسانی سانحات کے اس درندہ صفت حملہ آور کی علم دشمنی بھی اسی سیاہ باب کا ایک حصہ ہے۔ نادر مخطوطات اور قلمی کتب جنہیں ہمیشہ علم کا بیش بہا خزانہ سمجھا گیا بغداد پر حملے کے بعد دریائے فرات میں بہا کر غرقاب و معدوم کر دیے گئے۔ یہی نہیں بلکہ مدارس و علمی مراکز کو جو بغداد کے وقار کی علامت سمجھے جاتے تھے اس طرح تاراج و برباد کیا گیا کہ خود تاریخ اس پر نوحہ کناں ہے۔

جہل و آگہی کی یہ جنگ آج تک جاری و ساری ہے ہر چند کہ مظاہر تبدیل ہوتے رہے ہیں اہل یونان ہوں کہ ہم جنہیں تقسیم برصغیر کے وقت عظیم الشان علمی ورثہ سے محروم ہونا پڑا، ایک ہی تاریخی عمل سے گزر چکے ہیں دوسری طرف اس حقیقت کا ادراک کہ سرمایۂ دانش ہی پر جو اعلیٰ تعلیم سے مشروط ہے۔ معاشی ارتقاء کا بھی انحصار ہے جب بیدار ہوا تو مزاحم قوتیں صف آراء ہو گئیں اور اس کے باوجود کہ طلوع آزادی کے بعد اولین ترجیح کے طور پر بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ نے تعلیمی حکمتِ عملی کے رہنما خطوط مہیا فرما دیئے تھے ہماری بصیرت باختہ قیادتوں نے ان سے انحراف برتا یہاں تک کہ چھ دہائیوں سے زیادہ مدت گزر جانے اور متعدد تعلیمی پالیسیاں وضع کرنے کے باوجود ہم اپنی سمت کا تعین نہیں کر سکے ہیں۔ غیر یکساں تعلیمی نظام جس نے قوم کو طبقات میں تقسیم کر دیا ہے آج تک مسلط ہے۔ قومی زبان کو جو ہماری وحدت و طاقت کی ضامن ہے متنازعہ بنا دیا گیا ہے۔ ذہنی غلامی باعث تفاخر ٹھہری ہے۔ تمام اقدارِ حیات کو ہوس گزیدہ سیاست نے پابہ زنجیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ آئین کو جس کا احترام قومی فریضہ ہونا چاہیے ترمیم و تنسیخ

کے لئے تختۂ مشق بنالیا گیا ہے۔ جعلی اسناد کا تحفظ مطلوب ہو یا غیر آئینی انتخابات کو آئینی قرار دینا مقصود، ملکی دستور کو موم کی ناک بنا دینا ہر اقتدار پرست کا وطیرہ بن چکا ہے حد یہ ہے کہ آج سیاسی کردار کا ایک ایسا منظر نامہ مرتب ہو چکا ہے کہ جہاں "قاتل و مقتول" بغلگیر نظر آتے ہیں۔

ملکی تاریخ میں پہلی بار درست سمت میں ایک جرأت مندانہ قدم اُٹھایا گیا کہ سال ۲۰۰۲ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے متبادل کے طور پر ملک کے مایۂ ناز فرزند اور بین الاقوامی شہرت و احترام کے حامل سکالر اور ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر عطاء الرحمان کی سرکردگی میں اعلیٰ تعلیم کے کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے دائرہ کار میں جو اہم امور شامل کیے گئے ان میں اسناد کی تصدیق، معیار کی ضمانت نیز مربوط قومی منصوبہ بندی وغیرہ شامل تھے۔ ان مقاصد کا تعین جس پس منظر کی بنیاد پر کیا گیا وہ یہ تھا کہ جامعات میں وسائل کی کمی اساتذہ کی تربیت و ترغیبات کا غیر مؤثر نظام، تحقیق کی طرف عدم توجہی۔ اندرون و بیرون ملک بین الجامعاتی عدم اشتراک اور رابطہ کا فقدان وغیرہ۔ اعلیٰ تعلیم و تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے چنانچہ ڈاکٹر عطاء الرحمان کی عالمانہ و مدبرانہ قیادت میں کمیشن نے اپنی کارکردگی کا سکہ دنیا بھر میں جما دیا یہاں تک کہ کمیشن کے قیام کے وقت ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد صرف ایک لاکھ پچیس ہزار تھی جو چھ سال کے عرصہ میں چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ جامعات کی تعداد بھی ۵۷ سے بڑھ کر ۱۲۷ ہو گئی۔ پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی کا شمار دنیا کی اعلیٰ معیار کی یونیورسٹیوں میں نہیں ہوتا تھا لیکن اس مدت میں ہماری پانچ یونیورسٹیوں کو یہ اعزاز حاصل ہو گیا اور اس کے اعتراف میں عالمی بنک اور یو۔ ایس۔ ایڈ کی طرف سے کمیشن کو علی الترتیب تین اور پچیس کروڑ ڈالر کی امداد فراہم کی گئی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے چار سو طلباء بیرون ملک بھجوائے گئے جب کہ تین ہزار سے زائد طلباء نے ڈاکٹریٹ مکمل کیا۔

یہ وہ قابل فخر ترقی تھی جس کی بنا پر پاکستان کو عالمی تحقیق کے اُفق پر طلوع ہوتا ہوا ستارہ قرار دیا گیا حتیٰ کہ ہندوستان بھی ہماری پیروی پر مجبور ہوا۔ ڈاکٹر عطاالرحمان کو ان کی ان خدمات کے

اعتراف میں آسٹریا کا اعلیٰ ترین ایوارڈ دیا گیا جو پوری قوم کے لیے باعث فخر تھا لیکن پھر ہوا کیا کہ سیاسی قیادت کی تبدیلی کے ساتھ ہی یہ ادارہ ملک کی مجالس قانون ساز کے ان اراکین کی نظروں میں کھٹکنے لگا جن کی جعلی ڈگریوں کی تصدیق سے اس ادارہ نے معذرت کرلی جس کے نتیجے میں پچپن ارکان پارلیمان کی ڈگریاں جعلی قرار پائیں اور دوسو پچاس مشکوک جن میں بعض وزارئے کرام بھی شامل تھے چنانچہ ۲۰۱۰ء میں صوبوں اور وفاق کے درمیان قانون سازی کے آئینی تعینات کے پیش نظر ۱۹۷۳ء کے آئین میں اٹھارویں ترمیم لائی گئی۔

ترمیم پر عملدرآمد کے لئے جو پارلیمانی کمیٹی تشکیل دی گئی اس کی سربراہی مقتدر سیاسی جماعت کے ایک ذہین ماہر قانون کے سپرد کی گئی لیکن جب ذہانت گروہی سیاست ومفادات کے تابع ہوکر رہ جائے تو مثبت نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ موصوف نے فوراً ہی اعلان فرمادیا کہ وزارت تعلیم ومتعلقہ شعبہ جات کے ساتھ ہی اعلیٰ تعلیمی کمیشن بھی صوبوں کو منتقل کردیا جائیگا امریکہ نے اس اعلان کے ساتھ ہی ۲۵۰ ملین ڈالر کی امداد معطل کردی جب کہ پورے ملک میں اک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا کہ یہ اعلان نہ صرف قومی مفاد کے صریح منافی تھا بلکہ خود آئینی ترمیم سے بھی متصادم تھا آئین کے چوتھے شیڈول کے حصہ دوم میں وفاقی قانون سازی کی جو فہرست شامل ہے اس کی شق نمبر ۷ کے مطابق "سائنسی وتکنیکی تحقیق کے درمیان رابطہ کاری" وفاق کی ذمہ داری ہے۔ اس طرح شق نمبر ۱۲ کی روشنی میں وفاق کو اختیار ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے معیارات کا تعین کرے جب کہ پاکستان میں غیر ملکی طلباء اور بیرون ملک پاکستانی طلباء کے امور بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ بعد میں عدالت عظمیٰ پاکستان نے بھی مذکورہ شقوں کے مندرجات پر مہر تصدیق ثبت فرمادی۔

بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اعلیٰ تعلیم وتحقیق کے اس ادارے کو عملاً مفلوج اور شکست و ریخت سے دوچار کردینے کے لیے اب مزید سفاکانہ اقدامات کیے جارہے ہیں۔ گزشتہ سال (۲۰۱۰-۱۱ء) کے میزانیے میں مختص کردہ رقم کو ضروریات کے تخمینے (۳۰ بلین) سے گھٹا کر تقریباً

نصف (۷۶ء ۵ بلین) کر دیا گیا تھا اور اب (۱۲-۲۰۱۱ء) کے میزانیے میں مزید کٹوتی لگا کر مختص رقم صرف ۱۴ بلین رہ گئی ہے۔ جب کہ وفاقی سطح کے صرف دو ایوان ہائے بالا کے شاہانہ اخراجات میں صرف خفیف سی کمی کر کے معاشی ترقی میں موثر معاونت مہیا کرنے والے اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے ضامن اس مرکزی ادارے کو سہارا فراہم کیا جا سکتا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کے لیے مجموعی قومی آمدن کا ۴ فیصد مختص کیا جاتا ہے جبکہ اس میں اعلیٰ تعلیم کا حصہ ۲ فیصد ہوتا ہے۔ ہمارے قرب وجوار میں جنوبی کوریا کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں طالب علموں کی کل تعداد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی شرح ۸۸ فیصد ہے اور برادر ملک ترکی میں یہ شرح ۴۳ فیصد ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے کمیشن کو اپاہج بنا دینے کے نتیجے میں یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ یہ ادارہ عالمی بنک کی موجودہ ۳۰۰ بلین ڈالر کی امداد کی پیش کش سے بھی محروم ہو جائے گا کیونکہ یہ امداد جن اہداف کے حصول سے مشروط ہے ان میں وضائف کی تعداد میں اضافہ، تحقیقی مطبوعات میں اضافہ، تعلیمی اداروں تک سہل رسائی، معیار تعلیم میں اضافہ اور مستند و تجربہ کار اساتذہ کی تعداد بڑھانا شامل ہے۔ سال رواں کے دوران ہی ۲۶ مئی کو مظلوم و مقہور اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے ملک میں پہلی بار ایک قومی کانفرنس بعنوان "اکیسویں صدی کے پاکستان میں معیارات کا تعین" منعقد کی۔ ماہرین نے شرکت کی لیکن سرکاری سرپرستی کہیں نظر نہیں آئی۔۔۔۔۔ 'کسے گواہ کریں کس سے منصفی چاہیں'

از دشمناں برند شکایت بہ دوستاں
چوں دوست دشمن است شکایت کجا برم

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار (صدر شعبۂ اردو۔استنبول یونیورسٹی۔ترکی)

ترکی اور ترکوں کے سچے دوست۔۔۔مولانا محمد علی جوہرؒ

مولانا محمد علی جوہر ور مولانا شوکت علی بیسویں صدی کے شروع میں برصغیر میں پیدا ہونے والے معروف وطن پرور، ور آزادی خواہوں میں سے تھے۔ اُن کی پیدائش ۱۰ دسمبر ۱۸۸۷ء کو رامپور میں ہوئی۔ اُن کے خاندان کا تعلق روہیل کھنڈ کے یوسف زئی پٹھانوں سے تھا۔ وہ مولانا شوکت علی سے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ نجیب اور شریف خاندان سے منسلک تھے لیکن اُن کے والد کی وفات کے بعد اُن کے خاندان کے افراد سخت مالی مشکلات سے دوچار تھے۔ مولانا محمد علی اپنی پیدائش اور بچپن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''جس خالق نے مجھے ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ (۱۰ دسمبر ۱۸۸۷ء) کو پیدا فرمایا تھا اُس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کیے۔ پوری مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو عجیب عجیب خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۷ رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ کو میرے والد نے بعارضۂ ہیضہ کوئی تیس بتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت میری والدہ مرحومہ کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ سوائے قرآن پاک کے کچھ نہ پڑھا تھا۔ اس کی مدد سے خود اردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کرلی تھی۔ والد نے تیس پینتیس ہزار قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی جن میں سے سب سے بڑے کی عمر ۱۳ سال کی تھی جو تین برس ہی کی عمر میں مرگی کے موذی مرض میں مبتلا رہے اور سب سے چھوٹا میں خود تھا جس کی عمر اس وقت پونے دو سال کی تھی۔ مجھے اپنے والد مرحوم بالکل یاد نہیں مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ علاوہ اس فیض گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت نگرانی اور ترغیب و تحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا ہے

نصف (۶ء۷، ۵ بلین) کردیا گیا تھا اور اب (۱۲-۲۰۱۱ء) کے میزانیے میں مزید کٹوتی لگا کر مختص
رقم صرف ۱۴ بلین رہ گئی ہے۔ جب کہ وفاقی سطح کے صرف دو ایوان ہائے بالا کے شاہانہ اخراجات
میں صرف خفیف سی کمی کرکے معاشی ترقی میں موثر معاونت مہیا کرنے والے اعلیٰ تعلیم وتحقیق کے
ضامن اس مرکزی ادارے کو سہارا فراہم کیا جاسکتا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کے لیے مجموعی
قومی آمدن کا ۴ فیصد مختص کیا جاتا ہے جبکہ اس میں اعلیٰ تعلیم کا حصہ ۳ فیصد ہوتا ہے۔ ہمارے قرب
وجوار میں جنوبی کوریا کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں طالب علموں کی کل تعداد میں اعلیٰ تعلیم
حاصل کرنے والوں کی شرح ۸۸ فیصد ہے اور برادر ملک ترکی میں یہ شرح ۴۳ فیصد ہے۔ اعلیٰ
تعلیم کے کمیشن کو اپاہج بنا دینے کے نتیجے میں یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ یہ ادارہ عالمی بنک کی موجودہ
۳۰۰ بلین ڈالر کی امداد کی پیش کش سے بھی محروم ہوجائے گا کیونکہ یہ امداد جن اہداف کے حصول
سے مشروط ہے ان میں وظائف کی تعداد میں اضافہ، تحقیقی مطبوعات میں اضافہ، تعلیمی اداروں
تک مکمل رسائی، معیار تعلیم میں اضافہ اور مستند وتجربہ کار اساتذہ کی تعداد بڑھانا شامل ہے۔ سال
رواں کے دوران ہی ۲۶ مئی کو مظلوم ومقہور اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے ملک میں پہلی بار ایک قومی کانفرنس
بعنوان ''اکیسویں صدی کے پاکستان میں معیارات کا تعین'' منعقد کی۔ ماہرین نے تقاریر کیں
لیکن سرکاری سرپرستی کہیں نظر نہیں آئی۔۔۔۔۔ 'کسے گواہ کریں کس سے منصفی چاہیں'

از دشمناں برند شکایت بہ دوستاں
چوں دوست دشمن است شکایت کجا برم

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار (صدر شعبۂ اردو۔ استنبول یونیورسٹی۔ ترکی)

ترکی اور ترکوں کے سچے دوست۔۔ مولانا محمد علی جوہرؔ

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی بیسویں صدی کے شروع میں برصغیر میں پیدا ہونے والے معروف وطن پرور اور آزادی خواہوں میں سے تھے۔ اُن کی پیدائش ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو رامپور میں ہوئی۔ اُن کے خاندان کا تعلق روہیل کھنڈ کے یوسف زئی پٹھانوں سے تھا۔ وہ مولانا شوکت علی کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ نجیب اور شریف خاندان سے منسلک تھے لیکن اُن کے والد کی وفات کے بعد اُن کے خاندان کے افراد سخت مالی مشکلات سے دوچار تھے۔ مولانا محمد علی اپنی پیدائش اور بچپن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جس خالق نے مجھے ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ (۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء) کو پیدا فرمایا تھا اُس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کیے۔ پوری مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو عجیب عجیب خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۷ رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ کو میرے والد نے بعارضۂ ہیضہ کوئی تیس بتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت میری والدہ مرحومہ کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ سوائے قرآن پاک کے کچھ نہ پڑھا تھا۔ اس کی مدد سے خود اردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کر لی تھی۔ والد نے تیس پینتیس ہزار قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی جن میں سے سب سے بڑے کی عمر ۱۳ سال کی تھی جو تین برس ہی کی عمر میں مرگی کے موذی مرض میں مبتلا رہے اور سب سے چھوٹا میں خود تھا، جس کی عمر اُس وقت پونے دو سال کی تھی۔ مجھے اپنے والد مرحوم بالکل یاد نہیں مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا، علاوہ اس فیض گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت نگرانی اور ترغیب و تحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا ہے

میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اس مرحومہ کے ذریعے سے پہنچایا ہے۔" (۱)

مولانا کا بچپن انھیں مسائل کے درمیان گزرا لیکن اُن کی محترمہ والدہ کا سایہ شفقت ومحبت اُن کے سروں پر تھا اور اُن کی والدہ، بی اماں نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت بہترین انداز میں کرنے کی خاطر ہر ممکن کوشش کی۔ اُن کی والدہ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ محمد علی نے دیوبند، علی گڑھ، آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں جدید تاریخ اُن کا خاص موضوع تھا۔ ہندوستان واپسی پر وہ ریاست رامپور میں ایجوکیشن ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور پھر سول سروس سے منسلک ہوئے لیکن سرکاری کام کچھ اُن کے لیے موزوں نہیں تھا اور اُنھوں نے صحافت کے میدان میں بھی طبع آزمائی شروع کی۔ اِس دوران ہندوستان اور انگلینڈ کے مختلف اردو اور انگریزی اخباروں کے لیے کالم لکھنے لگے اور اپنی قابلیت کی بنا پر صحافت میں اُن کو کافی شہرت ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ اپنے عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مسلمانانِ عالم کی زبوں حالت سے سخت بے چین و بے قرار تھے اور اُن کو اس حالت سے بچانے کی غرض سے اُنھوں نے اپنی جدوجہد شروع کی اور اپنی زندگی، آرام وسکون، مال ودولت اور یہاں تک کہ اپنی آزادی کو بھی اس جدوجہد کی راہ میں قربان کر دیا۔ اس سلسلے میں انگریزی زبان میں "کامریڈ" وراردو زبان میں "ہمدرد" کے نام سے دو اخبارات جاری کیے اور اپنا بیشتر وقت اور دولت ان اخبارات کے لیے وقف کر دی۔ عالم اسلام کی نجات کے مقصد نے اُن کے دل ودماغ میں عشق جنونی کی حیثیت سے جگہ کر لی تھی اور ظاہر ہے کہ جب کسی کے دل میں عشق، جنون کی منزل سے آگے بڑھتا ہے تو وہ اس کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہوتا ہے۔ اور مولانا صاحب اس کے لیے تیار تھے اور اس سلسلے میں مکمل اور بہتر وسائل استعمال کرنا چاہتے تھے اور کامریڈ اور ہمدرد بھی ان کے مقاصد کے حصول میں بہترین وسائل تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اس بات کی توضیح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

"مولانا نے قوم کو مایوسی اور بےبسی کے دلدل میں پھنسا ہوا پایا۔ پہلے ۱۹۱۱ء میں انگریزی زبان میں کلکتہ سے ہفت روزہ "کامریڈ" خاص طور پر انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو جھنجوڑنے کے لیے نکالنا شروع کیا۔ درحقیقت مسلمانوں کی زبوں حالت ہی تھی جس کے سبب مولانا کو مجبوراً صحافت کی طرف مائل ہونا پڑا۔" (۲)

واقعتاً صرف بے چارے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت تھی جس نے مولانا کو اخبار شائع کرنے کی طرف رجوع کیا تھا ورنہ نہ شہرت کی خواہش تھی اور نہ ہی پیسہ کمانے کی غرض جوان کو اس میدان کارزار میں پریشان ہونے پر مجبور کردے! وہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو اپنے ایک خط ۲۴ اپریل ۱۹۲۴ء میں تحریر کرتے ہیں۔

"میں مضمون لکھ کر ہی اگر روزی کماتا یعنی اس کی تجارت کرتا تو انگریزی اخبار کم نہیں ہیں مگر مجھے ایڈیٹری کرنا نہیں ہے تبلیغ مد نظر تھی۔"

پھر وہ لکھتے ہیں:

"صحافی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ واقعات کو پوری صحت سے درج کرے۔ اُسے خیال رکھنا چاہیے کہ اتفاقی صحت کا معیار اتنا بلند ہو کہ مورخ اس کی تحریروں کی بنیاد پر تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا کر سکے۔ صحافی رائے عامہ کا ترجمان ہی نہیں، راہ نما بھی ہوتا ہے۔" (۳)

ضیاء الدین احمد برنی نے اپنی تصنیف "عظمت رفتہ" میں مولانا محمد علی جوہر سے متعلق اپنی یادوں میں "ہمدرد" کے سلسلے میں مولانا کی توجہ اور دلچسپی کا بیان یوں کیا:

"جب مولانا نے "ہمدرد" نکالنے کا ارادہ کیا تو اُنھوں نے اس کے لیے بہترین اسٹاف جمع کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے اُنھوں نے نہایت معقول مشاہرہ پر مولوی عبدالحلیم شرر کو طلب فرمایا۔ وہ کئی مہینے تک ٹائپ کے انتظار میں گھر بیٹھے تنخواہ پاتے رہے۔ اس کے بعد مولوی عبداللہ عمادی کو دعوت دی گئی۔ اُنھوں نے بھی کچھ دن ٹائپ کے انتظار کی زحمت برداشت کی اور پھر تشریف لے گئے۔ آخر میں نگہ انتخاب قاضی عبدالغفار پر پڑی۔ اُن کی

امداد کے لیے علی گڑھ کے اولڈ بوائے محمد فاروق ایم۔اے گورکھپوری اور قاضی عبدالعزیز منصور پوری لائے گئے۔ اُن کے علاوہ اسٹاف میں انگریزی اور عربی کے مترجم، رپورٹر اور پروف ریڈر بھی تھے قاری عباس حسین بھی پہلے دور کے ادارتی عملہ میں شامل تھے۔" (۴)

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ مولانا محمد علی اپنے زمانے کی معروف ہستیوں میں سے تھے اور اس عہد کے مشاہیر سے اُن کے گہرے تعلقات موجود تھے جن میں سے ایک علامہ محمد اقبال تھے۔ ضیاء الدین برنی صاحب مولانا کے علامہ سے "ہمدرد" کے پہلے شمارے کے لیے پیغام طلب کرنے اور موصول شدہ پیغام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جب ہمدرد نکالنے کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے تو مولانا نے اپنے دوست ڈاکٹر اقبال کو پیغام کے لیے لکھا۔ یہ پیغام پہلے نمبر میں نہ نکل سکا۔ دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے وہ ۲۵ فروری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ وہ پیغام یہ ہے

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دل صد چاک بلبل کی ۔۔۔ تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا ۔۔۔ جہان رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں ۔۔۔ تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے ۔۔۔ انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تنک بخشی کو استغنا سے پیغام خجالت دے ۔۔۔ نہ رہ منت کش شبنم نگوں جام و سبو کر لے

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو ۔۔۔ کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم ۔۔۔ مذاق جور گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے

اقبال کا یہ پیغام بہت خوبصورت انداز میں درحقیقت مولانا کے اپنے ہی خیالات کا اظہار تھا جس کے لیے وہ شب و روز کوشاں رہتے تھے۔ جہاں مولانا محمد علی بے باک اور بے خوف مصنف تھے وہیں وہ ایک باصلاحیت سیاستدان، باعلم عالم، قابل ادیب اور شاعر بھی تھے۔ برطانیہ کے خلاف جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور کئی سال تک جیل کے سیلوں کے مقیم رہے لیکن کبھی

کسی کے سامنے سر نہ جھکایا۔ ضیاء الدین احمد برنی صاحب کی تصنیف میں مولانا صاحب کے جیل کے دنوں سے متعلق ایک یاد، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کس قدر بلند حوصلہ اور ساتھ ساتھ کس قدر رحم دل تھے اور اپنے بھائی سے بھی محبت کرتے تھے:

''زمانہ قید کا ایک واقعہ ہے کہ بی اماں نے اپنے دونوں بیٹوں سے ملنے کے لیے حکومت کو درخواست دی۔ محمد علی سے تو ملنے کے لیے حکومت کی اجازت مل گئی مگر شوکت علی سے ملنے کی اجازت نہیں ملی کیونکہ جیل میں ان کی بعض ''حرکتوں'' کی وجہ سے اُن سے یہ رعایت چھین لی گئی تھی۔ اُس وقت مولانا محمد علی نے نہایت ایثار سے کام لے کر پُر لطف مگر محبت آمیز پیرایہ میں بی اماں کو یوں لکھا:

''میری جنت یا تلواروں کی چھاؤں میں ہے یا آپ کے قدموں کے نیچے۔ تاہم مجھے یہ قبول ہے کہ آپ کو دیکھے بغیر آپ سے ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں، مگر یہ ہرگز قبول نہیں کہ میں آپ کے دیدار سے سعادت اندوز ہو کروں اور شوکت کی آنکھیں اس نظارہ کو ترسا کریں۔ وہ ہر حالت میں مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی محبت اور اس انعام کے مستحق ہیں۔'' (۶)

مولانا محمد علی آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام میں سرگرم عمل رہے اور ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں منعقدہ اجلاس میں بھی شریک تھے اور ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی خدمات بجا لائے۔ وہ عالمِ اسلام پر چھائی ہوئی خون برساتی کالی گھٹاؤں سے بہت پریشان تھے اور انھوں نے اس کی شدت کو ہلکا کرنے کی مسلسل کوششیں جاری رکھیں۔ اُس عہد میں اسلامی دنیا کے اکثر و بیشتر حصے تو آبادیاتی طاقتوں کے قابو میں تھے اور باقی بس بچا تھا ترکی جس کا گلا بھی روز بروز زیادہ زور سے گھونٹا جا رہا تھا۔ بالخصوص برصغیر میں لوگ اس وجہ سے درہم برہم تھے اور اس ملے شدہ پروگرام کو روکنے کے لیے ہر ممکن جاں نثاری کرنے پر مصمم ارادہ رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مولانا محمد علی جوہر جیسے باشعور اور فعال مسلم مفکر اور مجاہد اس سے قطع تعلق نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے

بلقان کی جنگوں کے دوران انتہائی جدوجہد کی اور چندہ جمع کرنے کے لیے لوگوں کے سامنے اپنے دامن کھولنے سے بھی عار نہیں کیا اور جو کرنا تھا وہی کر دکھایا۔ جب ترکوں کو شکست ہو رہی تھی وہ دل افسردہ و پریشان پھرتے تھے اور جب ترک مختصر ہی سہی فتح حاصل کرتے تھے تو اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا تھا۔ بحر ضیاء الدین احمد برنی صاحب اپنی تصنیف "عظمتِ رفتہ" میں رقم طراز ہیں:

"جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے مولانا محمد علی کو بہت پریشان رکھا۔ وہ ترکوں کی پے درپے ہزیمتوں سے بے حد مغموم تھے۔ اُنھوں نے ان کے مصائب کو ہلکا کرنے کی غرض سے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں طبی مشن روانہ کیا۔ پہلی جنگ بلقان کے بعد جب "فاتحین" میں تقسیم غنیمت پر جھگڑا ہوا اور دوسری جنگ بلقان برپا ہوئی تو اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ترکوں نے ایڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اس وقت عالم اسلام میں غیر معمولی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ خبر جب رائٹر کے ذریعہ دہلی پہنچی تو اُس وقت رات بہت زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر مولانا کی ترک دوستی کا اندازہ کیجیے کہ انھوں نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ یہ خبر دوسری صبح کو اخبارات کے ذریعہ لوگوں تک پہنچے۔ چند رفقائے کار کو لے کر سیدھے جامع مسجد پہنچے اور راستہ بھر چلا چلا کر مسلمانوں کو یہ روح افزا خبر پہنچاتے رہے۔ بہر حال ناوقت ہونے کے باوجود جامع مسجد میں ہزارہا آدمیوں کا اجتماع ہوگیا۔ وہاں مولانا نے دردانگیز تقریر کرکے اس خبر کی اہمیت کو واضح کیا اور دولِ یورپ کی شاطرانہ چالوں کا پول کھولا۔ وہ رات بھی کیسی ہیجان انگیز تھی اور آج وہ سماں میرے سامنے جوں کا توں موجود ہے۔" (۷)

مولانا صاحب ترکوں کے حق میں خیر اندیش بھی تھے دور اندیش بھی۔ جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو عثمانیوں کے اس جنگ میں شمولیت کے نتیجے میں انہیں کیا مصیبتیں جھیلنی تھیں اور کیا نقصانات اُٹھانے تھے وہ یہ سب اپنی تقاریر میں اور اپنی نگارشات میں بیان کرتے رہے۔ جب لندن ٹائمز میں ترکوں کی مذمت میں مقالۂ افتتاحیہ شائع ہوا تو اُنھوں نے ردعمل ظاہر کر کے انور

پاشا کے نام ایک خط ارسال کیا جس کا مقصد انھیں غصہ و غضب میں آ کر اس جنگ میں کود پڑنے سے روکنا تھا۔ ضیاء الدین برنی صاحب اپنی یادوں میں لکھتے ہیں:

''۱۹۱۴ء میں دورانِ جنگ لندن ٹائمز نے '' چوائس آف ٹرکس'' (ترکوں کی پسند) کے عنوان سے ایک مقالۂ افتتاحیہ شائع کیا تھا جس میں ترکوں کو اچھی خاصی دھمکی دی گئی تھی۔ میں نے جب اس مضمون کو پڑھا تو اندیشہ ہوا کہ کہیں ترک اس قدر تلخ و ترش لہجے میں لکھے ہوئے مضمون کو پڑھ کر برطانیہ کے خلاف جنگ پر آمادہ نہ ہو جائیں اور چونکہ میں اس جنگ عمومی میں ترکوں کی شرکت کو ترکوں اور عام طور پر مسلمانوں اور بالخصوص مسلمانانِ ہندوستان کے لیے مضر سمجھتا تھا اس لیے میں مجبور ہو گیا کہ ایک بار پھر کوشش کروں کہ ترکوں کو اس جنگ کی شرکت سے باز رکھوں۔ گو مجھ جیسا حقیر شخص بھلا اس کا کس طرح یقین رکھ سکتا تھا کہ میری آواز اس اہم معاملے میں کارگر ثابت ہوگی۔ اس سے پہلے بھی میں اور ڈاکٹر انصاری انور پاشا کی خدمت میں اسی غرض سے ایک تار ارسال کر چکے تھے لیکن ٹائمز کے اس مضمون کو دیکھنے کے بعد مجھے اندیشہ ہوا کہ ہماری صلح جویانہ کوشش کہیں رایگاں نہ جائے اور گو اس ہفتے کے کامریڈ کے لیے میں ایک مقالہ افتتاحیہ تحریر کر چکا تھا اور پرچہ چھپنے کے لیے تیار تھا مگر اب میں اس قدر مجبور ہو گیا کہ اس مقالہ افتتاحیہ کو روک لیا اور ٹائمز کے مضمون کے عنوان ہی سے ایک اور مقالہ افتتاحیہ لکھنا شروع کیا۔ جس میں ترکوں سے پھر التجا کی کہ وہ اس جنگ کی آگ میں نہ کود پڑیں جو کوئی اور لڑتا ہو اُسے لڑنے دیں۔ مگر اپنی قوت کو محفوظ رکھیں، اس باعث ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کا کامریڈ اس تاریخ کے کئی دن بعد ہی نکل سکا۔ مگر میں نے اس میں اس کی بھی پروا نہیں کی۔ میرے دفتر کے لوگ اور میرے سینکڑوں احباب اس امر سے واقف ہیں کہ میں نے یہ مضمون لگاتار چالیس گھنٹے کی محنت شاقہ برداشت کر کے لکھا اور اس تمام عرصے میں ایک منٹ بھی نہ سویا اور جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا تو اخبار کے اسسٹنٹ منیجر دہلی کے سید شوکت صاحب کو بلا بھیجتا تھا۔ خود بولتا

جاتا تھا اور اُن سے لکھواتا تھا۔ اُس چالیس گھنٹے میں نہ صرف سونے سے محروم رہا بلکہ خوراک بھی قہوے کی چند پیالیوں سے بہ مشکل ہی بڑھنے پائی۔ اس کا نتیجہ وہ ۱۹ کالم کا مضمون تھا جس کی پاداش میں ۳ نومبر کو جس دن برطانیہ اور ترکی کے درمیان جنگ چھڑی کامریڈ پریس کی ضمانت ضبط ہوئی اور کامریڈ کو دس برس بند رہنا پڑا۔" (۸)

خیر نہ انور پاشا اُن کے خط سے رکنے والے تھے نہ انگریز سلطنتِ عثمانی کی تقسیم کی سازش کو ملتوی کرنے والے۔ بڑی طاقتوں کا پہلے سے طے کردہ پلان جاری تھا اس پر عمل بھی ہوا اور عثمانی سلطنت اس جنگ میں شامل ہونے پر مجبور کر دی گئی اور جو اللہ کو منظور تھا وہی ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ کے خاتمے پر ترکی کا بٹوارا عمل میں لایا گیا لیکن اظہر من الشمس امر تھا کہ ترک اس شکست کو نہیں مانیں گے اور یہی ہوا اور ترکی جنگِ آزادی شروع ہوئی اور باہر برصغیر میں ترکوں کے ہمدرد دردمندوں کی جدوجہد تیز سے تیز تر ہو گئی۔ مولانا محمد علی جوہر اس تحریک کے ہراول دستے میں سربراہ کی حیثیت سے عمل پیرا ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کے بانیوں میں سے ہوئے اور ساتھ ساتھ ہندوستان کی آزادی کی خاطر بھی کوشاں رہے۔

ہاں اُن کا ترکوں سے دوستانہ برتاؤ اور دلی محبت اندھا دھند نہ تھی۔ وہ ترکوں میں اپنے خیالات کے برعکس کوئی بات دیکھتے تھے تو اُس پر بھی نکتہ چینی کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اُن کی نگاہ میں ترک اچھے مسلمان تھے لیکن اچھے مبلغ نہیں اور مذہب کے سلسلے میں وہ حد سے زیادہ رواداری سے کام لیتے تھے اور یہ رواداری ترکوں کی حکمرانی کے علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد کے کم ہونے کی واحد وجہ تھی۔ خیر ایک ترک کی حیثیت سے مجھے یہاں ایک نوٹ چھوڑنا ہے کہ ترک کیا کریں۔ وہ تو تعداد میں بہت کم مختلف قبائل تھے اور جہاں جہاں وہ جا رہے تھے وہاں وہ آٹے میں نمک کے برابر تھے لیکن پھر بھی اُنھوں نے عریض و وسیع علاقوں میں حکمرانی برپا کی اور کبھی اسلام سے روگردانی نہیں کی۔ خیر یہ تو ایک ترک کا خیال ہے اب ہم مولانا صاحب کی طرف پھر رجوع کریں۔ وہ لکھتے ہیں۔

”صوفیان باصفا کا صدقہ ہے کہ مسلمان ہر صوبے میں ایک ہی تناسب سے منقسم نہیں۔ صوبہ جات متحدہ میں جو صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت کا مرکز رہا ہے۔ اگر ہماری تعداد ۶۴ لاکھ ۸۱ ہزار ہے اور ہنود کی تعداد ۳ کروڑ ۸۶ لاکھ ۱۰ ہزار ہے (جو اس کا بین ثبوت ہے کہ ہم نے بزور شمشیر اسلام نہیں پھیلایا) تو بنگال میں، جہاں اسلام کے مبلغ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھیل گئے اور جہاں مزدوروں اور کاشت کاروں کو انھوں نے کولین برہمنوں کے پنجہ سے چھڑایا، اگر ہندو ۲ کروڑ ۲۱ لاکھ ۶ ہزار ہیں تو مسلمان ۲ کروڑ ۲۵ لاکھ ۱۲ ہزار رہیں۔

اسی طرح پنجاب میں جہاں افسوس ہے کہ پیر پرستی کی بدعت آج بہت رائج ہے زیادہ تر اُن ہی پیروں کے آباؤ اجداد کی خدا پرستی نے یہ صورت پیدا کردی کہ اگر ہندو ۹۵ لاکھ ۹۷ ہزار ہیں تو مسلمان ایک کروڑ ۱۱ لاکھ ۴۴ ہزار ہیں۔ میں ترکوں کا بڑا مداح ہوں اور میرا خیال ہے کہ عرب اور عجم کو جو کچھ بھی اُن پر فضیلت ہو لیکن روزمرہ کی زندگی اناطولیہ کے ترکوں کی صدیوں سے اسلامی ہے اتنی نہ عربوں کی رہی ہے نہ ایرانیوں کی۔ اگر یورپ کے نصاریٰ اس سبب سے ترکوں کے دشمن ہوتے تو سمجھ سکتا تھا۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ وہ ترکوں پر مذہبی ناروا داری کا الزام لگاتے ہیں اور انھیں نصرانیت کا دشمن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ترکی ہی وہ ملک ہے جہاں ترکوں کی رواداری کے باعث نصاریٰ کا ہر فرقہ جو آج تک موجود ہے اور جو نصرانیت کے سوادِ اعظم سے علیحدہ ہو کر نکلا تھا اور یورپ کے کسی نصرانی ملک میں آج باقی نہیں اور رومہا اور رومن اور ”ریفرمیشن“ کی ناروا داری کا عرصہ ہوا کہ شکار ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ چکا۔

خیر یہ تو دوسری بحث ہے۔ مگر مجھے جو یہاں عرض کرنا ہے وہ یہ ہے ترکوں کو اُن کی اسلامی زندگی پر عربوں اور ایرانیوں پر افضلیت تو حاصل ہے مگر ان کی مذہبی رواداری یقیناً حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی اور انھوں نے ہرگز تبلیغ اسلام کا وہ کام نہیں کیا جو عربوں نے کیا۔ عرب جہاں پہنچے

اُنھوں نے اس مذہبی فریضہ کو انجام دیا اور آج جہاں جہاں اسلام ہے وہ زیادہ تر عربوں ہی کی تبلیغ کا طفیل ہے۔ جہاں جہاں ترک گئے وہاں مسلمانوں کی تعداد بہت کم بڑھی۔ ایران اور افغانستان اور وسط ایشیا کے اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کی تعداد کس قدر کم ہے اور خود ترکی اور ہندوستان کی طرح اُن ممالک میں جنھیں ترکوں نے فتح کیا غیر مسلموں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے۔ ایران اور وسط ایشیا اور افغانستان کا اسلام تو عربوں کی تبلیغ کا نتیجہ ہے۔ لیکن ترکی اور ہندوستان میں غیر مسلموں کی اکثریت ترکوں کی اور ایرانیوں کی ممنونِ احسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان اور صوبہ سرحد میں تو ہنود کالعدم ہیں لیکن پنجاب تک میں اُن کی ایک بڑی تعداد ہے۔

صوبۂ سرحد چونکہ آج ہندوستان میں شامل ہے اس لیے باوجود ہنود اور سکھوں کی اُس طرف پنجاب سے ہجرت کر کے سکونت اختیار کرنے کے وہاں کی مسلم آبادی ۲۰ ہزار ہے اور ہنود کی تعداد ایک لاکھ ۹۳ ہزار ہے۔ سندھ کو عربوں نے فتح کیا تھا اور اگر چہ یہ اسی کے دریا "انڈس" کا طفیل ہے کہ دنیا اُس ملک کے باشندوں کی اکثریت کو ہندو کہتی ہے اور اس ملک کو ہندوستان کے نام سے پکارتی ہے تاہم علاقہ سندھ کے باشندوں کی اکثریت عربوں کی فتح اور مبلغین اسلام کے طفیل سے آج تک مسلم اکثریت ہے اور کل ۳۲ لاکھ ۷۹ ہزار کی آبادی میں ہنود غالباً ۲۸ فی صد کی اقلیت میں ہیں۔" (۹)

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے مولانا جوہر بہت بے باک آدمی تھے۔ اُنھوں نے پہلی اسلامی موتمر میں شاہ مسعود کے سامنے جو برملا اور بے دھڑک باتیں کیں وہ کسی چھوٹے دل کے مالک شخص کے ذہن سے بھی نہ گزرے۔ خیر بڑے دل والے بھی اکثر ایسی بات کہنے کی جرآت نہیں کرسکتے، وہ اور بات ہے۔ ضیاء الدین برنی صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا بڑے بے باک صحافی تھے۔ وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار برملا کیا کرتے تھے۔ پہلی اسلامی موتمر میں جو ۱۹۲۶ء میں حج کے موقع پر منعقد ہوئی تھی، انہوں نے سلطان ابن مسعود سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

"تُو اپنے آپ کو اس مقدس سرزمین (ملکِ حجاز) کا بادشاہ کہتا اور کہلواتا ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی بسر کی تھی حالانکہ تیرے پیش روترکوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو خادم الحرمین الشریفین کہا اور کہلوایا۔ تُو بھی اُن کی تقلید میں اپنے آپ کو خادم الحرمین کہہ اور ملوکیت پر جو معاویہ کی سنت ہے، ہرگز ہرگز نہ چل۔" (۱۰)

یہ باہمت ہستی یعنی مولانا محمد علی صاحب، ترکِ موالات میں گاندھی جی کے برابر کے شریک تھے۔ بعد میں ستیہ گرہ کی تحریک کے دوران فروری ۱۹۲۲ء میں چوری چورا میں ۲۳ پولیس سپاہیوں کے تھانے کے اندر بند کر کے زندہ جلائے جانے کے بعد مولانا اور گاندھی جی کے درمیان اختلافات رونما ہوئے۔ انڈیا میں جواہر لال نہرو اور کانگریس کی پالیسیوں سے مسلمانوں کی ناامیدی بڑھنے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد علی جوہر بھی کانگریس سے دور ہونے لگے اور آزاد ہند میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں زیادہ انہماک سے دلچسپی لینے لگے۔ ساتھ ساتھ کل ہند کی آزادی بھی اُن کا مطمحِ نظر تھی اور وہ اس کے حصول کے لیے بھی جاں فشانی سے کام کر رہے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں مولانا صاحب گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے اور ۴ جنوری ۱۹۳۱ء میں لندن میں ہی انتقال کر گئے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ انگلینڈ گئے تو انگریزی حکام سے کہا کہ اگر ہندوستان کو آزادی فی الفور نہیں دیں گے تو میں انڈیا واپس نہیں جاؤں گا اور آپ کو میری قبر یہیں بنانا پڑے گی۔ شاید یہ بات اُن کی دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی کہ وہ لندن میں ہی وفات پا گئے۔

راقم کی خواہش اس عظیم شخصیت کے بارے میں طویل مضمون لکھنا نہیں ہے۔ بس دل چاہا کہ اُن کی یاد تازہ ہو جائے شاید کسی کے دل میں اُتر جائے میری بات! آخر میں رئیس احمد جعفری صاحب کی ان کے بارے میں لکھی ہوئی کچھ سطور پیش کرنا چاہتا ہوں شاید اُن کی شخصیت کے مختلف پہلو ایک نظر میں سامنے آجائیں۔ رئیس احمد جعفری صاحب لکھتے ہیں:

"محمد علی جیسے جامع خصوصیت و جامع حیثیت انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کی

وفات پر دنیا کے ایک مشہور مفکر اور انشا پرداز ایچ۔ جی۔ ویلز نے کہا تھا ”محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا۔ اُس کی زبان برک کی زبان تھی، اُس کا قلم میکالے کا قلم تھا“ یہ غلط نہیں تھا لیکن اگر ہم اس مفہوم کو زیادہ صنعت کے ساتھ ادا کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ میکالے کے قلم میں وہ زور تھا جو محمد علی کے زورِ قلم سے مشابہ تھا۔ برک کی زبان میں وہ خطابت تھی جو محمد علی کے زورِ قلم سے ملتی جلتی تھی، نپولین کے سینے میں وہ دل تھا جو محمد علی کے قلبِ آہنی سے مشابہت رکھتا تھا، اور جو کچھ اُن سب میں تھا بلکہ اُس سے بھی زیادہ اکیلے محمد علی کی ذات میں موجود تھا۔

”آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری!“

وہ واعظ نہیں تھا، خطیب نہیں تھا، ناصح نہ تھا، لیکن بزم و انجمن میں اُس کا چرچا تھا، اُس کی تقریر لوگوں کے دلوں کی آنکھیں کھول دیتی تھی، اُس کی اثر آفرینی سنگ دلوں میں گداز پیدا کر دیتی تھی، اُس کا خلوص سرکشوں اور باغیوں کو مطیع و منقاد بنا لیتا تھا۔ واعظانِ شیریں مقال کے پند و موعظت میں وہ اثر نہیں تھا جو محمد علی کی ”گلوگیر“ آواز میں تھا۔ طاقتِ لسان اور فصاحتِ بیان کے جوہر دکھانے والے خطیبوں میں وہ کشش اور جاذبیت نہیں تھی جو محمد علی کے چند سادہ اور صاف جملوں میں نظر آتی تھی۔ نصیحت گروں اور ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر“ کی دعوت دینے والوں میں وہ سوز و گداز، وہ رقت نہیں تھی جو محمد علی کی زبان میں تھی، وہ جب روتا تھا تو مجمع کی آنکھیں بھی پُرنم ہو جاتی تھیں، وہ ہنستا تھا تو مجمع بھی باغ و بہار بن جاتا تھا۔ وہ جب چلتا تھا تو مجمع میں بھی صبا رفتاری پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ جب رکتا تھا تو مجمع محکوم، وہ دل کی مملکت کا بادشاہ تھا اور دل اُس کا زیرِ نگیں۔ وہ جوش بھی تھا اور فکر بھی۔ وہ دل بھی تھا اور دماغ بھی۔ وہ مجاہد بھی تھا اور شاعر بھی۔ وہ سب کچھ تھا۔ وہ اس جہاں سے رخصت ہوا تو کچھ نہ رہ گیا۔

وہ اس ملت کا امیر اور رہنما تھا جو سیدھے راستے سے دُور تھی، وہ ملت غبارِ راہ کی طرح ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھی، سنگِ راہ کی طرح ٹھوکروں سے پامال ہو رہی تھی، محمد علی گرجتا ہوا، برستا ہوا، للکارتا ہوا میدان میں آیا اور اُس کے آتے ہی وہ غبارِ راہ طوفان بن گیا! وہ طوفان جس نے استعمار

کی دیواروں میں تزلزل برپا کردیا جس نے سامراج کے نظام کو زیرو زبر کردیا جس نے استبداد کو لرزہ براندام کردیا جس نے شہنشاہیت، قیصریت، آمریت اور مطلق العنانیت کے کنگرہ ہائے فلک بوس کو سرنگوں کردیا! اُس نے میدان عمل میں نزول اجلال فرماتے ہی، سنگ راہ کو سنگ خارا بنا دیا۔ کیا یہ محمد علی کا اعجاز نہیں تھا جس کا نام محمدؐ اور علیؓ سے مرکب ہو، ضرور تھا کہ اس میں اُس کے وجود میں اس کی ہستی میں چراغ مصطفویؐ کی ضیا گستری در عزم حیدری کی جھلک نظر آئے، اگر وہ صاحب اعجاز نہ ہوا اور کون ہوسکتا ہے؟ اُس نے اپنی ملت کو بنایا، لیکن خود تباہ ہوگیا۔ اُس نے چمن ملت کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی اور خود مضمحل ہوتا چلا گیا۔ اُس نے دل اور روح کی پوری قوت سے قوم میں بیداری کی لہریں پیدا کیں، لیکن ہر ہر نعرہ پر اُس کا دل کمزور اور اُس کی روح مضمحل ہوتی چلی گئی۔ اُس نے مُردوں کو زندہ کردیا لیکن خود ایک خوفناک آغوش میں پہنچ گیا۔ جہاز کا ناخدا اپنے وجود کو خطرہ میں ڈال کر بھی مسافروں کی جان بچالیتا ہے، فوج کا سپہ سالار گولیوں کی بوچھار میں کھڑا رہ کر بھی فوج کو نکال لے جاتا ہے، قوم کا سردار ہجوم آفات کے باوجود قوم کو نہیں مرنے دیتا، محمد علی نے یہی کام کیا اور یہی اُس کے شایانِ شان تھا۔" (۱۱)

حواشی اور حوالے

۱ صابر ارشاد عثمانی، مولانا محمد علی جوہر (حیات و خدمات)، اسلام آباد ۲۰۰۷ء ص ۸۰۔۸۱

۲ صابر ارشاد عثمانی، ص ۱۱۱

۳ صابر ارشاد عثمانی، ص ۱۱۰

۴ ضیاء الدین احمد برنی، عظمت

۵ ضیاء الدین احمد برنی، ص ۵۰

۶ ضیاء الدین احمد برنی، ص ۵۷

۷ ضیاء الدین احمد برنی، ص ۵۱۔۵۲

۸ ضیاء الدین احمد برنی، ص ۵۳

۹ ضیاء الدین احمد برنی، ص ۵۳

۱۰ ضیاء الدین احمد برنی، ص ۵۹

۱۱ صابر ارشاد عثمانی، ص ۶۷۔۷۰

ڈاکٹر نذر عابد

فیض کی امیجری

ABSTRACT

Imagery is the crux of sublime thoughts and purist imagination. Elevated poetic imagery always appeals to the senses of human beings. It represents objects, actions, feelings, different states of mind,sensory and extra sensory experiences. Poetic images may be visual, olfactory, auditory, tactile etc. and usually transform auditory sense into visual sense effectively. In this article,the writer has explored and analysed critically such poetic imagery presented by the legendry Urdu poet Faiz Ahmad Faiz in his poetry in the light of modern techniques of criticism.

تخلیقِ شعر دراصل لفظی صورت گری ہے۔ شاعر اس تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے اپنے مشاہدات اور تجربات کو تخیل کی کرشمہ سازی کے طفیل ایک نئی اور تازہ ترتیب کے ساتھ لفظی پیکروں میں ڈھال دیتا ہے۔ ان لفظی پیکروں اور شعری تمثالوں کو تخلیقی سطح پر حرکت آشنا اور حرارت آمیز بنانے کی خاطر شاعر اپنے داخلی جذبہ و احساس کی آنچ کو بروئے کار لاتا ہے۔ تخیل کی سحر آفرینی اور جذبہ و احساس کی گھلاوٹ کے باعث شاعر کے تخلیق کردہ یہ لفظی پیکر لَو دے اُٹھتے ہیں اور قاری و سامع کی حسیات پر اثر انداز ہوتے ہوئے اُسے کسی حد تک شاعر کے تخلیقی تجربے کی بازیافت کے

عمل سے گزرانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ شاعر کے تخلیقی عمل میں شرکت کا یہ احساس نہ صرف شعر کی تفہیم و تحلیل میں مدد دیتا ہے بلکہ پڑھنے والے کو روحانی سطح پر مسرت و بہجت سے بھی ہمکنار کر دیتا ہے۔ شاعری کی یہ تخلیقی فعالیت قاری و سامع کے حوالے سے جس حظ آفرینی اور وجدانی و روحانی بالیدگی اور ترفع پر منتج ہوتی ہے، اُسے مدنظر رکھتے ہوئے مولانا عبدالرحمٰن شعر کو معنوی تصویر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وصف کا شعر ایک قسم کی معنوی تصویر ہے جو اگرچہ بہت سی باتوں میں مصور کی سادہ و رنگین تصویر کو نہیں پہنچتی لیکن بہت سی باتوں میں مصور کی تصویر سے سبقت لے جاتی ہے۔ شاعر بہت کم کسی چیز کی پوری پوری تصویر کھینچتا ہے۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ جس چیز کا وصف کرنا چاہتا ہے اُس کی چند نمایاں، پسندیدہ، آنکھوں میں بسی اور سمائی ہوئی خصوصیات ایسی چن لیتا ہے کہ وہی تصویر کی جان یا کم از کم مناسب مقام ہوتی ہیں اور شاعر کی زبان پر آ کر موصوف کی پوری پوری تصویر سننے والے کی آنکھوں کے سامنے لا رکھتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ موصوف کے وہی خط و خال شاعر کے شعور کو جنبش میں لاتے اور سامع کو عالم خیال میں وہاں پہنچاتے ہیں جہاں اُس کی تصویر پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ شاعر کی اس تصویر سے وہ اُس ذہنی صورت تک پہنچتا ہے اور اُن کی مطابقت سے لطف اٹھاتا ہے۔'' (۱)

شاعری میں محض لفظی تصویروں کے انبار لگا دینے سے امیجری کے تقاضے پورے نہیں ہوتے یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب ان لفظی پیکروں میں شاعر کے داخلی جذبات و احساسات کی گھلاوٹ موجود ہو و راُن کے بطون سے وہ روشنی پھوٹنے لگے جس کا منبع شاعر کی اپنی ذات اور اُس کا تخلیقی شعور ہے۔ ان لفظی پیکروں میں مُردنی کا احساس چھایا رہے گا جب تک کہ اُن کی نبضیں شاعری کی آنچ دیتی پوروں کی حرارت سے لمس آشنا نہ ہو جائیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں:

''فن کار اپنے تصورات، تجربات اور محسوسات اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والوں

تک اُس کے تجربے کی نوعیت پہنچ جائے۔ دُوسرے الفاظ میں فن کی کامیابی میں ترسیل یا ابلاغ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ خصوصاً شاعری میں الفاظ کا استعمال صرف معلومات مہیا کرنے کے لیے نہیں بلکہ ذہنی تصویریں اور جذباتی کیفیتیں پیدا کرنے کے لیے ہے۔" (۲)

فیض کے ہاں پائی جانے والی امیجری کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کے تخلیق کردہ شعری پیکروں میں ایک طرف اعلیٰ سطح کے تخیل کی رنگ آمیزی موجود ہے تو دوسری طرف اُن کے جذبہ و احساس کی شدت ان لفظی تمثالوں میں حرکت و حرارت بھر دیتی ہے۔ اُن کے ہاں اُبھرنے والی شعری تمثالوں پر ان کے داخلی مزاج کی عکس ریزی غالب رہتی ہے۔ اُن کی شخصیت کا دھیما پن اکثر اُن کی شاعری میں سمعی سطح پر ہلکے سروں اور مدہم لَے میں بولتے سمعی پیکروں اور دھیمے رنگوں اور ہلکے شیڈز سے آراستہ بصری پیکروں کے رُوپ میں اظہار پاتا ہے۔ فیض کی مشہور نظم "موضوعِ سخن" کے ابتدائی بندوں میں ایک خاص کیفیت کی بوجھے دھیمے لہجہ اور مدہم رنگوں میں پیکر تراشی ملتی ہے۔ کسی سلگتی ہوئی شام کی افسردگی، چشمۂ مہتاب سے رات کا ڈھل کر نکلنا، ترستے ہاتھوں اور مشتاق نگاہوں کی آرزوؤں کا رنگ لانا، کسی کے رُخسار، آنچل اور پیراہن سے چلمنوں کا رنگین ہونا، زلفوں کی گھنی چھاؤں میں آویزوں کا ٹمٹمانا، خوابیدہ آنکھوں میں کاجل کی لکیر اور نرم و نازک ہتھیلیوں پر دھندلی سی حنائی تحریر کی موجودگی اور کسی عارض پر غازے کا ہلکا سا غبار وہ شعری پیکر ہیں جنہیں فیض نے اپنی اس نظم میں بڑی مدہم روشنی اور بڑی دھیمی لے میں پیش کیا ہے۔ ان تمام شعری تمثالوں کے پس منظر میں جذبے کی ہلکی سی آنچ محسوس ہوتی ہے جو قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ پیکر تراشی کرتے ہوئے فیض نے کیسے کیسے رنگ اور کیسے کیسے شیڈز استعمال کیے ہیں، اس کا اندازہ یہ اشعار پڑھ کر بخوبی ہو جاتا ہے۔

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام   ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی   اور ان ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

ان کا آنچل ہے کہ رُخسار کہ پیراہن ہے   کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں
آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رُخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار صندلی ہاتھ پہ دُھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی، اشعار کی دُنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی

(۳)

فیض اپنے لفظی پیکروں میں شدتِ احساس کی آمیزش سے ایسی حرکی توانائی بھر دیتے ہیں جو ان کی حیاتِ نو کا باعث بنتی ہے۔ اس کی ایک جھلک اُن کی نظم "پاس رہو" کے ان مصرعوں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔

تم مرے پاس رہو

مرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو مرہم مشک لیے، نشترِ الماس لیے
جس گھڑی رات چلے بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے (۴)

ان لائنوں میں ان گنت ستاروں کا ہو پیے، سیہ ماتمی رات کو ایسے روپ میں ظاہر کیا گیا ہے جس سے بیک وقت ظلم و ستم، رنج و الم، بے بسی، اُجاڑ پن اور ویرانی کی جنوں آثار کیفیات سمعی اور بصری سطح پر محسوس ہونے لگتی ہیں لیکن اس شعری فن پارے میں تخلیق کی گئی امیجری کی کامیابی اور تاثر پذیری کا بنیادی سبب یہی ہے کہ مذکورہ تمام کیفیات شاعر کے باطنی کرب اور داخلی جذبے سے وابستہ ہیں۔

فیض کے ہاں اکثر مقامات پر شام کے دھندلکے اور رات کے مہیب سناٹے کے تناظر میں تخلیق کی گئی امیجری اپنے مخصوص تاثراتی رنگوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اُن کی نظم "ایک منظر" میں ایک ایسا منظر نامہ ترتیب پاتا ہے جہاں خارجی سطح پر بام و در خاموشی کے بوجھ تلے دبے ہوئے نظر آتے

ہیں، چاندنی اپنے تمام تر دکھوں سمیت خاک میں جذب ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ جب کہ داخلی سطح پر خواب گاہوں کی نیم تاریکی پُر اسراریت کا مظہر بن کر سامنے آتی ہے اور مجموعی طور پر زندگی کسی بھیدوں بھری رات کے ایک ایسے حسّی پیکر میں ڈھلنے لگتی ہے جو مضمحل لے میں فریاد کناں ہے۔

بام و در خامشی کے بوجھ سے چُور — آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نور — شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی — مضمحل لے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں (۵)

فیض کے زمانۂ اسیری کے یادگار شعری سرمائے میں "زنداں کی ایک صبح" اور "زنداں کی ایک شام" میں بھی شام و سحر کے حوالے سے ایسے شعری پیکر تخلیق ہوئے ہیں جن میں دُکھ کی لہریں سانس لیتی ہوئی محسوس کی جا سکتی ہیں۔ خاص طور پر "زنداں کی ایک صبح" میں رخصت ہوتی رات اور نمودار ہوتی صبح کا منظر دکھاتے ہوئے شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر چاندی کے بھنور رقصاں دکھانا اور رات اور صبح کا دیر تک گلے ملتے رہنا کمال کی پیکر تراشی ہے۔

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آ کر — چاند نے مجھ سے کہا جاگ، سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصہ تھی — جام کے لب سے تہِ جام اُتر آئی ہے
عکسِ جاناں کو وداع ☆ کر کے اٹھی میری نظر — شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور — چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مُرجھاتے رہے، کھلتے رہے — رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

☆ ہم فیض مرحوم کے کلام سے بردست تصدیق نہیں کر سکے تاہم لفظ 'وداع' میں حرف 'ع' کا بحر سے متجاوز ہو جانا محلِ نظر ہے (ادارہ)

اسی طرح نظم ''زنداں کی ایک شام'' میں فیض نے امیجری کا ایک ایسا نظام ترتیب دیا ہے جو بیک وقت مختلف حسیات پر انوکھے زاویوں سے اثر انداز ہونے کی قدرت رکھتا ہے۔ نظم کے ابتدائی مصرعوں ہی میں زینہ زینہ اترتی رات کی چاپ اور صبا کی سرگوشیاں سامعتوں میں ابھرنے لگتی ہیں۔ صحن زنداں کے بے وطن سرنگوں اشجار کی محویت اور اس کے نتیجے میں دامن آسماں پر بنتے نقش ونگار بصری تحرک کا باعث بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاک میں گھلتی آب نجوم اور آسمان کے سبز گوشوں اور نیلگوں سایوں کی رنگ آمیزی بھی بصری پیکروں کی تعمیر وتشکیل میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ شانۂ بام پر مہربان چاندنی کا دست جمیل لمس کے احساس کو جنم دیتا ہے جب کہ زندگی کی شیرینی اور ظلم کے زہر کی گھلاوٹوں کا تذکرہ حس ذائقہ پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ ان تمام تر خارجی نوعیت کی لفظی تمثالوں میں ''موج درد فراق یار'' کا نقش ابھار کے شاعر نے داخلی کرب کی وہ آنچ بھی بھر دی ہے جو ان شعری پیکروں میں حرکت وحرارت اور سوز دروں کا باعث بن رہی ہے۔ شاعر کا یہی داخلی جذبہ اور سوز دروں توانائی کا وہ سرچشمہ ہے جو تخلیقی سطح پر شعری پیکروں کے دوام کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔

شام کے پیچ و خم ستاروں سے	زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے	جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحن زنداں کے بے وطن اشجار	سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامن آسماں پہ نقش و نگار	شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دست جمیل	خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل	سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں، جس طرح دل میں	موج درد فراق یار آئے
دل سے پیہم خیال کہتا ہے	اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے	کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں   وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں   (۷)

فیض کی نظم "شام" ایک ایسی نظم ہے جس میں ان کی شعری کائنات میں مروجہ علامتی و استعاراتی نظام سے ہٹ کر ایسے تلازمات کو برتا گیا ہے، جن کے زیرِ اثر مرتب ہونیوالی لفظی تمثالوں میں تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ پیڑ کو کسی اُجڑے ہوئے بے نور مندر کی صورت میں اور آسمان کو جسم پر بھبھوت رمائے اور ماتھے پر سیندور سجائے کسی پروہت کے روپ میں دیکھنا ایسی امیجری کی تخلیق کا باعث بنا ہے جس سے کائناتی تفہیم کے نئے زاویے جنم لیتے ہیں۔ اس نظم میں تخلیق کردہ لفظی تمثالوں کے ذریعے ایسا جادوئی ماحول ترتیب دیا گیا ہے جس میں خاموشی، جمود اور ٹھہراؤ کی کیفیات مجسم ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ نظم کے آخر میں شاعر نے چپ کی زنجیر کے کٹنے، ناقوس کے بجنے، کسی پائل کے بولنے، کسی بُت کے انگڑائی لینے اور گھونگھٹ کھلنے کی سرسراہٹ سے صوتی اور حرکی سطح پر اس قدر کامیاب پیکر تراشی کی ہے کہ خود نظم کے مطابق عملی طور پر یہ واقعات ابھی تک ظہور پذیر نہ ہونے کے باوجود محض شاعر کی شدید خواہش کے زیرِ اثر منجمد ماحول میں ہوراڑیں پڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے   کوئی اُجڑا ہوا بے نور پرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے   چاک ہر بام، ہر اک در کا دمِ آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے   جسم پر راکھ ملے، ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے   اس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام   دامنِ وقت سے پیوست ہے یوں دامنِ شام
اب کبھی شام بجھے گی، نہ اندھیرا ہوگا   آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھوٹے   دے کوئی سنکھ دُہائی، کوئی پائل بولے

کوئی بت جاگے کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے (۸)

بعض اوقات فیض نے ایسے حسی پیکر بھی تخلیق کیے ہیں جو بیک وقت نطق اور خاموشی کی امتزاجی نمائندگی کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے آواز خاموشیوں میں ڈھل گئی ہو یا خاموشیاں مدھم لے میں بول اٹھی ہوں۔ اُن کی نظم ''سرودِ شبانہ'' میں ایسی ہی کیفیت نمودار ہوتی ہے جہاں آواز کی تھکاوٹ خاموشی میں صورت پذیر ہو رہی ہے اور کہکشاں کی نیم وا آنکھیں گفتگو کرتی سنائی دیتی ہیں۔

سو رہی ہے گھنے درختوں پر　　چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے　　کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز

(۹)

فیض کی نظم ''یاد'' میں بہت سے ایسے شعری پیکروں کا سراغ ملتا ہے جو پڑھنے والے کے مختلف حواس کو بیک وقت متاثر و متحرک کر دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس نظم میں دشت تنہائی کا ایک ایسا منظر نامہ مرتب ہوا ہے، جہاں آواز لرزتے سایوں میں مجسم ہو کر ایک ہی وقت میں سماعت اور بصارت پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ دوری کے خس و خاک تلے کھلتے قربتوں کے گلاب اور خوشبو میں سلگتی ہوئی آنچ دیتی سانسیں بصارت اور شامہ کے حواس میں یکساں سطح کا تحرک پیدا کر رہی ہیں جب کہ دلدار نظر کی قطرہ قطرہ گرتی شبنم اور رُخ پر دل پر یادوں کی تھپکیاں بصری، سمعی اور لمسیاتی احساس کو جنم دیتی ہیں۔ غرض اس نظم میں کمال کی مخلوط پیکر تراشی کی گئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نظم میں تخلیق کی گئی تمام تر لفظی تمثالیں امید اور یقین کے اُجالوں سے منوّر ہیں۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں　　تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دُوری کے خس و خاک تلے　　کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ　　اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدہم مدہم
دور اُفق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ　　گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم
اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے　　دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق　　ڈھل چکا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

(۱۰)

فیض کی ایک نظم میں شاہراہ حیات کو ایک غمزدہ عورت کے رُوپ میں تمثیلی رنگوں اور مجمد زاویوں کے ساتھ ایسے پیکروں میں پیش کیا گیا ہے کہ زندگی کی بے بسی، افسردگی اور ویرانی مجسم ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس نظم میں تخلیق کی گئی مجمد لفظی تصویر کا کمال یہ بھی ہے کہ اس میں پیش کیے گئے تمثیلی کردار کے ذریعے زندگی کی تمام تر نا آسودہ خواہشوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ دور اُفق پر نظریں جمائے رکھنے اور مسلسل محو خیال رہنے کا تصور اُبھار کر یاسیت اور ناامیدی کی دھند میں انتظار اور امید کی کرنیں بھی بھر دی گئی ہیں۔

ایک افسردہ شاہرہ ہے دراز　　دور افق پہ نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کی　　سرمگیں حسن کو بچھائے ہوئے
جس طرح کوئی غمزدہ عورت　　اپنے ویراں کدے میں محوِ خیال
وصلِ محبوب کے تصور میں　　مو بہ مو چُور، عضو عضو نڈھال

(۱۱)

فیض کی شاعری میں تلاش کیا گیا رجائیت کا یہی رویہ ان کی شاعری کا وہ بنیادی رنگ ہے جو ان سے تخلیق کیے گئے شعری پیکروں میں جا بجا جھلکتا ہے۔ یوں ان کی شعری کائنات میں ایک ایسا منظر نامہ ابھرتا ہے جس سے زندگی کی اعلیٰ قدروں اور عظیم روئیوں کی روشنی چھن رہی ہے۔

حوالہ جات

۱ مرآۃ الشعر، مولانا عبدالرحمٰن، بک ایمپوریم، لاہور (س۔ن)، ص ۲۷۵

۲ اُردو مرثیے کا ارتقاء، ڈاکٹر مسیح الزماں، اتر پردیش اُردو اکیڈمی لکھنؤ طبع دوم ۱۹۹۲ء ص ۳۶۴

۳ نقش فریادی، فیض احمد فیض، مکتبہ کارواں، لاہور۔ (س ن) ص ۸۱

۴ دست تہِ سنگ، فیض احمد فیض، مکتبہ کارواں، لاہور۔ (س ن) ص ۴۲

۵ نقش فریادی " ص ۴۷

۶ دستِ صبا، فیض احمد فیض، مکتبہ کارواں، لاہور۔ (س۔ن) ص ۸۵

۷ دستِ صبا " ص ۸۳

۸ دست تہِ سنگ " ص ۳۲

۹ نقش فریادی ص ۶۶

۱۰ دست صبا " ص ۸۸

۱۱ نقش فریادی ص ۸۶

ڈاکٹر انور سدید

ناول نویسی کے قافلہ سالار۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (مرحوم)

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا ذکر ہو رہا ہو تو مجھے ان کے دو ناول "شام اودھ" اور "سنگم" ضرور یاد آتے ہیں۔ اور پھر ان کا وہ مضمون بھی لوحِ دماغ پر ابھر آتا ہے جو انہوں نے قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کے خلاف لکھا تھا، یہ مضمون لکھنے کے بعد بھی ان کا فاروقی مزاج۔ کل پہ اعتدال نہ ہوا تو انہوں نے خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کو "آگ کا دریا" کے مقابل لا کھڑا کیا۔ "آنگن" پر دو مضامین رسالہ "فنون" میں چھپوائے جس کے مدیر خدیجہ مستور کے سسرالی رشتہ دار احمد ندیم قاسمی تھے (خدیجہ مستور کی شادی قاسمی صاحب کے بھانجے ظہیر بابر سے ہوئی تھی)۔ اب یہ بات شاید معیارِ فن کی ہے کہ قرۃ العین حیدر کے سامنے خدیجہ مستور کا چراغ جل نہ سکا۔ اور جانبداری کے الزام میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی صاحب کو بھی دھر لیا گیا۔ وقت کے ساتھ یہ بحث تاریخ کے اوراق میں دفن ہو گئی ہے تو مجھے یہ حقیقت تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ محمد احسن فاروقی ایک بڑے تخلیق کار تھے۔ ان کا ناول "شام اودھ" لکھنوی کلچر کا اور "سنگم" مسلمانوں کی تہذیب کا مرقع ہے۔ ان کا خود سوانحی ناول "دل کے آئینے میں" نسیم درانی نے جو ان کے فن کے سچے اور مخلص مداح ہیں اپنے رسالہ "سیپ" میں قسطوں میں شائع کیا لیکن احسن فاروقی کی بے نیازی دیکھیے کہ اتنے اہم ناول کو کتابی صورت دیے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب سوانحی ناول لکھنے والوں میں ممتاز مفتی ("علی پور کا ایلی اور الکھ نگری")۔ قرۃ العین حیدر ("کارِ جہاں دراز ہے") اور احمد بشیر "دل بھٹکے گا" کا ذکر تو خاصی افراط سے ہوتا ہے۔ لیکن احسن فاروقی کو اردو ناول کے تناظر میں ان کا حق ادا نہیں کیا گیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کے ناول "شام اودھ" "سنگم" اور "دل کے آئینے میں"۔۔۔ میں سے کوئی ایک ناول بھی   اے۔ آر۔ خاتون، رضیہ

بٹ، اے حمید، نسیم حجازی، زبیدہ خاتون اور طارق اسمٰعیل ساگر کے ناولوں جیسی مقبولیت حاصل نہیں کر سکا۔ میرے خیال میں اس دلیل کو ڈاکٹر احسن فاروقی کے خلاف استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ وجہ یہ کہ سب مقبول اور مشہور ناول اوّل درجے کے ناول نہیں ہوتے۔ اور کسی ناول کی مقبولیت اس ناول کے بلند معیار کی ضمانت نہیں ہوتی۔ اردو کی ممتاز ناول نگار محترمہ قرۃ العین حیدر نے ''آگ کا دریا''۔۔۔''گردشِ رنگِ چمن''۔۔''آخرِ شب کے ہم سفر''۔۔''چاندنی بیگم'' اور ''کارِ جہاں دراز ہے'' کی نامور مصنفہ ہونے کے باوجود کمال ظرف سے اعتراف کیا کہ گلشن نندہ کے ناول ان کے ناولوں سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں اور زیادہ تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ محمد احسن فاروقی کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو چند بلند معیار ناول عطا کیے جن کو اس فن کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ اور جو موضوع، اُسلوب پلاٹ، کردار اور ماحول کے اعتبار سے ڈاکٹر احسن فاروقی کی انفرادیت قائم کرتے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد اردو ناول کے کسی جائزے اور تاریخ کی کسی کتاب میں انہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے ''آزادی کے بعد اردو ناول'' میں گذشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصے کے ناول کا تجزیہ ہیئت، اسالیب اور رجحانات کے اعتبار سے کیا گیا ہے اور ڈاکٹر احسن فاروقی کو اس کتاب کی ابتدا ہی میں اہم مقام دیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی یہ تحقیقی کاوش ان الفاظ میں ان کے نام انتساب کی ہے۔

> ''نقاد، افسانہ نگار، ناول نویس اور استاد محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر احسن فاروقی کے نام جنہوں نے ناول کے متنوع پہلوؤں پر وقیع تنقیدی و تحقیقی کام کیا جس کے حوالے سے اردو ادب ان پر ہمیشہ ناز کرے گا۔''

ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے ان کے متذکرہ تین ناولوں کا تجزیہ پوری غیر جانبداری سے کیا اور ''خود سوانحی رجحان'' میں ان کے فراموش شدہ ناول ''دل کے آئینے میں'' کا ذکر کیا تو لکھا:

''۔۔۔اس میں تکنیک کا تجربہ بھی ہے اور ڈاکٹر احسن فاروقی کے انتہائی رواں اور دلپذیر

اسلوب نے اس کو قابلِ ذکر بنا دیا ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنی پوری زندگی کو فکشن (Fiction) کے قالب میں فنی کامیابی کے ساتھ ڈھال دیا ہے۔ اور وہ اس میں ہیرو کی بجائے ویلین (Vill on) نظر آتے ہیں۔"

("آزادی کے بعد اردو ناول" ص ۲۰۲، اشاعت ۲۰۰۸ء)

بلا شبہ ڈاکٹر احسن فاروقی آزادی کے بعد رونما ہونے والے اہم ہی نہیں، قافلہ سالار ناول نگار ہیں کیوں کہ انہوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد ناول کی تخلیق نگاری پر زیادہ توجہ دی اور ان کی یہ خدمت بے لوث تھی۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے انگریزی زبان و ادب کا استاد ہونے کے ناطے انگریزی ناول کا مطالعہ بالاستیعاب کیا تھا۔ نقاد ہونے کے ناطے انہوں نے مغرب اور مشرق کے ناول پر گہری تنقیدی اور تجزیاتی نظر ڈالی تھی اور "ناول کی تاریخ" کے علاوہ "ناول کیا ہے؟" کے عنوان سے دو مبسوط کتابیں لکھیں جو اب اس موضوع پر حوالے کی بنیادی کتابیں شمار ہوتی ہیں اور جو تحقیق میں معاونت کرتی ہیں۔ یہ کہنا درست ہے کہ وہ اردو ناول کے بھی سنجیدہ قاری نقاد اور مصنف تھے۔ اس پر مستزاد انگریزی ادب کی تدریس کے دوران انہوں نے ناول کے فن پر لیکچر بھی دیئے۔ ان کے طلبا فخر سے کہتے تھے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی ناول کے مشکل موضوع کی فنی خوبیاں ناول کے باطن سے عطر کی طرح کشید کرتے اور خوشبو اپنے طلبا میں بکھیر دیتے تھے۔ آخری بات یہ کہ ڈاکٹر احسن فاروقی تخلیقی نثری ادب میں ناول کو بلند ترین درجہ دیتے تھے۔ بلا شبہ انہوں نے مختصر افسانے کا مرتبہ کم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی لیکن وہ ناول کے زیادہ مداح تھے اور تسلیم کرتے تھے کہ زمان و مکاں کی کلیت کو تمام تر جزئیات میں پیش کرنے کے لیے ناول بہترین صنف ادب ہے اور اسے کسی مخصوص خطے کی پوری زندگی پیش کرنے کا فن قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول "شامِ اودھ" چھپا تو اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ یہ اس آفتاب کی کرنوں کو مجتمع کرنے کی کاوش تھی جو کبھی لکھنؤ کے در و دیوار سے ابھرا تھا اور عالم تاب بن

گیا تھا۔ لیکن اس تہذیب پر سقوطِ لکھنؤ کے بعد زوال آیا تو پہلے اس شہر نگاراں و فرخندہ جمالاں پر انگریز قابض ہو گئے اور آزادی کے بعد پنجاب کے بند و شرنارتھی گھس آئے تو وہ لکھنؤ مرحوم ہو گیا جو ناول "شام اودھ" میں آج بھی زندہ ہے۔ لیکن بدلتی ہوئی قدروں اور آئندہ کے زوالِ مسلسل کا پتہ دے رہا ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی "شام اودھ" لکھ کر شاید مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ وہ اس دور میں ایک نیا سورج طلوع ہوتے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے "شام اودھ" کے اختتامیہ کو ایک سلسلہ نو کی صورت دی تو ایک چھوٹا سا ناول "صبح بنارس" لکھا جو ماہنامہ "ساقی کراچی" میں شاہد احمد دہلوی نے بصد تزک و احتشام شائع کیا لیکن کتابی صورت میں یہ بھی منظرِ عام پر نہ آسکا۔ شاید اس ناول کا اب کسی کو بھی علم نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اردو ناول پر ڈاکٹر ممتاز احمد خان اور ڈاکٹر سید محمد عقیل کی نئی کتابوں میں "صبح بنارس" کا ذکر موجود نہیں ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کی اس خوبی کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے نسبی فاروقی جلال کو زندہ رکھتے تھے۔ اور حزبِ اختلاف کا کردار ڈٹ کر ادا کرتے تھے۔ اس کے آثار ان کی تنقیدی کتابوں میں نمایاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو ادب میں انگریزی ادب کے "پرسنل لیٹے" (Personal Essey) کو اردو میں انشائیہ کے نام سے متعارف کرایا تو ڈاکٹر احسن فاروقی نے ایک نئی صنفِ ادب "تنقیدی انشائیہ" کے نام سے پیش کر دی جس کے وہ موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اس نئی صنف پر انہوں نے پوری توجہ دی لیکن انہوں نے فوقیت ناول نگاری ہی کو دی، چنانچہ اعلیٰ پائے کا نقاد اور انگریزی ادب کا مورخ ہونے کے باوجود میں انہیں تخلیقی اعتبار سے فکشن کا فن کار ہی تصور کرتا ہوں اور وہ شاید پاکستان کے پہلے ناول نگار تھے جنہوں نے زمان و مکاں کے تسلسل کو اردو ناول میں برقرار رکھا اور "ماشے اللہ سے ایم اے" کے ذیلی عنوان سے ایک پنج شاخہ لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن اس سلسلے کے صرف تین ناول "آبلہ پا"۔۔۔ "سنگ گراں اور" "یہ بہاریں تو نہیں تھیں" شائع کرا سکے۔ تسلسل زمان و مکاں کی اس تکنیک کو محترم نثار عزیز بٹ نے "نگری نگری پھرا مسافر"۔۔۔ "نے چراغے نے گلے" اور "کاروانِ وجود" عنوان کے ناولوں میں بڑی کامیابی سے

استعمال کیا ہے لیکن یہ اعزاز ڈاکٹر احسن فاروقی کو ہی جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی سوچ کو "آگ کا دریا" کے انداز میں کئی زمانوں پر محیط کیا اور "سنگم" جیسا معرکہ آرا ناول تخلیق کیا جس میں مصنف خود ایک مرکزی مینار ہے اور متعدد زمانے اس کے گرد روشنی کی مشعلیں اٹھائے گردش کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے اردو ناول میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کرنے کی بھی کامیاب کاوش کی اور پوری زندگی کو ناول میں منعکس کرنے کا خیال آیا تو خود سوانحی ناول "دل کے آئینے میں" لکھا تاہم ڈاکٹر احسن فاروقی کی اس کاوش کو اوّلیت کا درجہ حاصل نہیں۔ احسن فاروقی کے ناول کی رسالہ "سیپ" میں قسط وار اشاعت سے پہلے ممتاز مفتی کا سوانحی ناول "علی پور کا ایلی" چھپ چکا تھا۔ لیکن اس دلچسپ حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ممتاز مفتی نے ابتدا میں "علی پور کا ایلی" کو خود سوانحی ناول قرار نہیں دیا اور اسے "پاکستان رائیٹرز گلڈ" کے ادبی انعام کے لیے بھیجا گیا تو اسے طبع زاد ناولوں کی ذیل میں رکھا گیا تھا (اس ضخیم ناول کے مقابلے میں انعام جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاش بہاراں" کو دیا گیا جو اس زمانے میں ادب میں نووارد اور ناپختہ تھیں)۔ دوسری طرف ڈاکٹر احسن فاروقی نے "دل کے آئینے میں" کے راوی (واحد متکلم) کو اپنا ہم زاد بلکہ احسن فاروقی ہی شمار کیا تھا۔ اور اسے خود سوانحی ناول قرار دیا۔ ممتاز مفتی کے حلقۂ احباب میں کچھ لوگ (مثلاً اشفاق احمد۔ قدرت اللہ شہاب، ابن انشاء، احمد بشیر اور بانو قدسیہ) جانتے تھے کہ علی پور کا ایلی خود ممتاز مفتی تھا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ جب قرۃ العین حیدر نے "کارِ جہاں دراز ہے" شائع کیا تو ممتاز مفتی کو بھی حوصلہ ہوا کہ وہ اپنے ناول کے فرضی کرداروں کو مرئی حقیقت کا لباس پہنا دیں اور منکشف کر دیں کہ کس کردار کے پردے میں ان کی حقیقی زندگی کا کون سا کردار اپنے پورے جذبات و احساسات کے ساتھ موجود تھا اور واقعہ بندی میں سرگرم حصہ لے رہا تھا ۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ممتاز مفتی نے "الکھ نگری" کو اوّل الذکر ناول "علی پور کا ایلی" کا دوسرا حصہ قرار دیا تھا۔ اس وقت زمانے کے دریا کے پل سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ اور "علی پور کا ایلی" میں بعض واقعات جو حقیقی تھے شامل کرنے پر ممتاز مفتی پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ خدشہ یہ تھا کہ یہ واقعات اقدار شکن قرار دیے جائیں گے اور تنگ نظر معاشرہ انہیں قبول نہیں کرے گا۔ نتیجہ ممتاز مفتی کی

سنگ ساری کی تحریک پر بھی فتح ہو سکتا تھا۔ لیکن بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اقدار نے خود اپنا چولہ بدل لیا تھا۔ جو نا خوب تھا اب خوب بن چکا تھا۔ چنانچہ پچاس کی دہائی میں جو واقعات فرضی کرداروں سے منسوب کر کے ناول کا حق ادا کر دیا جاتا تھا اب زندگی کا معمول بن چکے تھے۔ چنانچہ ان کے اظہار پر نہ مصنف خوف کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ اس مرحلے پر ہی ممتاز مفتی نے علی پور کا ایلی" خود ہونے کا اعتراف کر لیا اور دیگر کرداروں کی نشاندہی بھی کر دی جن میں ایک اہم کردار ان کے والد صاحب کا تھا۔

میں نے یہ تفصیل اس لیے پیش کی ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے کسی قسم کے خوف کو اپنی ذات پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ اور "دل کے آئینے میں" جاگیرداری کے کلچر کے وہ لرزہ خیز واقعات بھی بیان کر دیئے جن سے ان کی حقیقی بہن گزری تھی۔ ان واقعات کا درد اس ناول میں بھی سما گیا ہے اور قاری کو بہت متاثر کرتا ہے۔ اور یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب احسن فاروقی یہ سب کچھ لکھ رہے تھے تو وہ کس کرب سے گزر رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ڈاکٹر احسن فاروقی کو پاکستان میں دانشوری کی روایت کا صحیح معنی میں منفرد نمائندہ قرار دیا اور انہیں ہمیشہ پڑھتے، لکھتے اور بحثوں میں الجھتے دیکھا۔ ان کے مضامین، افسانے، تنقیدی انشائیے ور ناولوں کی قسطیں رسائل و جرائد میں بکھری پڑی ہیں۔ ان کی زندگی میں کسی ناشر نے انہیں چھاپنے کی زحمت گوارا نہ کی اور احسن فاروقی صاحب بھی اپنی خودی، خودداری اور استغناء کے تحفظ میں گم رہے۔ فروری ۱۹۷۸ء میں کراچی سے کوئٹہ جارہے تھے کہ ریل گاڑی میں دل کا دورہ پڑا اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اردو ادب ایک بڑے نقاد اور ناول نگار سے محروم ہو گیا۔

ڈاکٹر مظہر حامد

دہلی، لکھنو اور رامپور کے دبستانِ شاعری

اقبال سے پہلے چار دبستان شاعری اپنے اپنے طرز پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ پہلا دہلی کا دبستان شاعری جس میں شعرائے متاخرین داغ دہلوی اور ان کے معاصرین کا رنگ شاعری نمایاں تھا۔ دوسرا دبستان لکھنوی شاعری کا تھا۔ تیسرا دبستان رام پور سے وابستہ شعراء کا تھا اور چوتھا دبستان شعرائے پنجاب پر مشتمل تھا۔ آزاد، حالی جس کے روح رواں تھے۔ یہاں پر ہم الگ الگ دبستانوں کا اجمالی جائزہ لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ان دبستانوں میں رنگ شاعری کیا تھا اور اقبال نے اپنی شاعری کی بنیاد کن منفرد اصولوں پر استوار کی۔

دہلی کا دبستان شاعری:

ہندوستان کی تاریخ میں دہلی کو وہی حیثیت حاصل ہے جیسے دل کو دوسرے اعضاء پر حاصل ہے۔ دہلی کی سرزمین پر معرکہ خیر وشر بھی ہوا، محبت کے ترانے بھی گائے گئے، عروج کی کہانی بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور زوال بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عالمگیر کی وفات کے بعد ہی ہندوستان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ نہ وہ محفلیں رہیں، نہ وہ احباب رہے، نہ ادب رہا اور نہ شعور لوگوں میں باقی رہا۔ ایک ایسی بدنظمی پھیلی جس میں سیاسی، معاشی، سماجی اور معاشرتی بدحالی کے نقوش واضح نظر آتے ہیں۔ فسادات، افراتفری، خوف و ہراس، مایوسی، قتل و غارت ان حالات میں لوگ جائے اماں ڈھونڈتے پھر رہے تھے جسے دیکھو ایک اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا، افلاس کی چکی میں لوگ بری طرح پس رہے تھے، جس چہرے پر نظر پڑتی مرجھایا ہوا نظر آتا، نہ سر پر سائبان اور نہ کوئی روزگار، بس لوگ زندہ تھے اور جینے کی سزا کاٹ رہے تھے۔

کہیں چنگ و رباب کی محفلیں گرم تھیں اور کہیں سلاسل کی جھنکاریں زندانوں میں گونج رہی

جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دلی — مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی — خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

شعراء کی غزلوں میں بھی اس عہد کی عکاسی ملتی ہے۔ دلی کی شاعری میں زیادہ تر تصوف سے کام لیا گیا جو وقت اور حالات کا تقاضا تھا کیونکہ اخلاق اور انسانی قدریں ختم ہو چکی تھیں۔ اس لیے متصوفانہ شاعری سے اخلاق کی درستگی اور مردہ دلوں میں نئی روح پھونکی گئی۔ نظریۂ وحدت الوجودی کے ذریعہ لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ جو اسم ذات ہے وہی تو اللہ ہے اور اسی جذبہ سے سرشار ہو کر مسلمانوں نے اپنے دین اور اسلام کے احیاء کے لیے ٹھوس اقدامات کیے اور شعری مواد میں اس نظریہ کا پرچار کیا۔ ہندوؤں کے ہاں بھی اس نظریہ کا نام ویدانت کے نام سے ہے۔ اسلام میں تصوف کا رنگ حضرت امام غزالیؒ کے ہاتھوں مزید گہرا ہوا۔ شاعری میں آتشؔ و اصغرؔ نے متصوفانہ شاعری کو فروغ دیا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی تصوف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"تصوف اس زمانے کے تمدن میں شعر و شاعری کے ہنگامے کا بہت بڑا محرک ہے۔ صوفیہ اس عہد اور اس تہذیب کا ذہنی طبقہ ہیں اور تصوف ہی معیار عقل، علمیت، تہذیب و اخلاق تھا۔ لیکن تصوف کے لیے ضروری ہو گیا تھا عشق و عاشقی۔ اس لیے عشق و محبت، عشق و معشوقی ان زمانوں میں نہ صرف عام ہیں بلکہ عقلی صلاحیت، اخلاقی بلندی اور تہذیب نفس کی دلیل سمجھتے ہیں۔" ؎

میر سے غالب اور غالب سے داغ تک شاعری کا مزاج اور مضامین میں وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ متصوفانہ شاعری کے ساتھ ساتھ دیگر شعراء کے ہاں تصنع، تکلف، معاملہ بندی، صنائع بدائع، عشق کے پیچ و خم کو شاعری کا امتیاز سمجھا جاتا تھا جب کہ متصوفانہ شاعری میں اخلاق اور تہذیبی اقدار کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ لیکن داغ نے اپنی شاعری کی بنیاد معاملہ بندی اور محاورہ پر رکھی اور یہی رنگ ان کے شاگردوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ استاد داغ کا تتبع باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ یہ دور خالصۃً غزل کا دور تھا اور اس دور میں اساتذہ کی تقلید اور روایت کو زیادہ دخل تھا۔ ڈاکٹر نورالحسن

شاعری کا رنگ و آہنگ اہل کمال کے ہاں جس انداز سے جلوہ گر ہوا، وہ کچھ یوں ہے کہ شاعری میں شوخی، معاملہ بندی، جذبات نگاری، رنگینی، محاورہ بندی، ابتذال آمیز فکر، قافیہ پیمائی اور مبالغہ تاہم اس کے ساتھ زبان کا بھی خیال رکھا گیا۔

دہلی دبستان کی شاعری میں متانت، سنجیدگی، سلاست و صفائی اور متصوفانہ رنگ نمایاں تھا دہلی کے آخری دور کی شاعری میں مرزا داغ نے اپنی تیز طبع سے شاعری کے رنگ کو بدلا۔ داغ کا خاص رنگ چلبلا پن مزاح، طعنہ، چنچل، گدگدی، جوش، تازگی، چہک، خوش گفتاری، ظرافت، چھیڑ چھاڑ غرض سخن میں ایسی چھیڑ چھاڑ ملتی ہے جو کسی اور کے یہاں نہیں۔ شاعری میں ایسی زبان اختیار کی ہے گویا باتیں کر رہے ہیں۔ داغ کے اشعار منظر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ داغ کے یہاں گہرائی گیرائی یا فلسفہ نہیں ہے۔ وہ تو عشق کی بات کرتے ہیں۔ محبوب سے چھیڑ چھاڑ، ہجر و وصال کے قصے، فرسودہ واقعات جو رسمی طرز پر ہیں جب کہ امیر مینائی کے کلام میں سلاست سادگی، محاورات کا صحیح استعمال ہوا ہے محاورے داغ کے ہاں مثالی ہیں۔ دہلوی رنگ کے نمائندہ شاعر ہونے کی حیثیت سے داغ نے زبان کی جو خدمت کی ہے وہ سب پر روشن ہے۔

زبان کے معاملے میں دہلی اور لکھنؤ میں شروع ہی سے ایک فرق پایا جاتا ہے۔ زبان اور ملکی سیاست ان دونوں کا مرکز دہلی رہا اور زیادہ تر اساتذۂ فن دہلی ہی سے وابستہ رہے اس لیے دہلی کی زبان دیگر دبستانوں سے زیادہ اہم اور مستند سمجھی جاتی تھی۔

یوں تو دہلی میں متعدد بار قیامت برپا ہوئی اس شکست و ریخت کے نتیجہ میں، خاص کر دہلی کا ہر بار اجڑنا، اس بربادی سے لوگ بدحال اور بدحواس ہو چکے تھے۔ ملک میں اقتصادی اور معاشی بدحالی کا دور دورہ ہوا تو اہل کمال، اہل فن اور شعراء، ادبا بھی وقت کی چکی میں پس گئے۔ مفلسی گھر میں گہری نیند سو رہی تھی۔ سازشوں اور سیاسی چالوں سے تنگ آ کر لوگوں نے دہلی سے لکھنؤ کی طرف رخ کیا کیونکہ لکھنؤ میں دولت کی فراوانی تھی لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے، فارغ البالی اور آسودگی کے چراغ ہر گھر میں جل رہے تھے۔ لکھنؤ میں سیاسی بازی گری نہیں تھی۔

لوگ چین کی زندگی گزار رہے تھے، رقص و سرود کی محفلیں گرم تھیں۔ ایسے میں دہلی کے شعراء جب لکھنؤ پہنچے تو ان کا خیر مقدم کیا گیا، ان کی قدردانی بھی کی گئی، وظیفے دیے گئے اور معقول روزگار فراہم کیا گیا تاکہ انہیں یہاں پر کسی بات کی تکلیف اور رنج نہ اٹھانا پڑیں۔ لکھنؤ کے نوابین کے ساتھ ان شعراء کی صحبتیں اور مشاعروں میں شرکت بھی اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ دہلی کو اگر ہم سیاسی اور معاشی تناظر میں دیکھیں تو ہمارا ادب اس بات کا آئینہ دار ہے۔ شعراء نے ان واقعات و حالات کو قلمبند کیا ہے جب کہ غالب نے اپنے متعدد خطوط میں ان حالات کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ چند وجوہات تھیں جن سے آشنا کر شعراء ادبا لکھنؤ کی سرزمین پر آباد ہوئے۔ یہاں ان کی پذیرائی اور قدردانی کی گئی اس طرح یہ طبقہ بھی آسودہ حال ہو گیا۔

دبستان لکھنؤ:

لکھنؤ دبستان شاعری میں جو خصوصیات ہمیں نظر آئیں ہیں، ان میں پہلی بات تو یہ ہے کہ بودو باش میں خواتین کا طرز خاص زبان میں اپنایا گیا اور ایسی زبان اختیار کی گئی جس میں ابتذال اور معاملہ بندی حدود سے آگے نکل گئی سطحی شاعری پر اتر آنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ لکھنؤ کی اس دور کی تہذیب پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ تصنع، تکلف اور عشق مجازی کے رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں جو رجحان ہمیں ملتے ہیں وہ سب معاشرت ہی کے اثرات ہیں۔ دراصل پورا لکھنؤ اسی ایک رنگ میں غرق تھا۔ شاعری میں معاملہ بندی فحش نگاری کو عیب نہ جانتے تھے بلکہ اسے ادب کا حصہ بنایا ہوا تھا۔ شعرائے متاخرین کے ہاں قدیم شعراء کی تقلید بھی ہے اور انحراف بھی۔ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق پایا جاتا ہے، اس کی واضح مثال یہ ہے۔ دہلی کی شاعری میں سادگی، سلاست اور فصاحت کو دیکھا جا سکتا ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں بلاغت، رعایت لفظی، معاملہ بندی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ اگر ہم دونوں دبستانوں کی شاعری کا طائرانہ جائزہ لیں تو یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جرأت سے پہلے کی شاعری اور بعد کی شاعری میں وہ تمام مضامین باندھے جا چکے تھے جو ہمیں فارسی ادب کی تاریخ میں ملتے ہیں

مثلاً عشق حقیقی قلبی واردات، تصنع، تکلف متصوفانہ لب ولہجہ کی شاعری غرض اردو شاعری کا دامن وسیع تر ہو گیا تھا پھر بھی بہت کچھ کہنے کو باقی تھا۔۔۔ معاملہ بندی، بیگمات کے ساتھ گفت وشنید رکھنا ،خواتین کے طرز خاص میں شاعری کرنا، عورت کے نقش ونگار اور اعضائے جسم کی مصوری کرنا۔ جرأت نے بھی ایسی شاعری کی جسے ہم عامیانہ شاعری ہی کہہ سکتے ہیں۔

تذکرۂ مصحفی میں شعراء کی کثیر تعداد جو دہلی سے لکھنؤ پہنچی ان شعراء کے رنگ شاعری نے لکھنؤ کی شاعری پر جو اثرات مرتب کیے اہل لکھنؤ کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ وہ خود اپنی ہی شاعری کو مستند قرار دیتے ہیں۔ زبان کے معاملے میں جلال لکھنوی اور ناسخ نے جو اصلاح کا کام کیا ہے، وہ یقیناً اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ ناسخ کے تلامذہ استاد کی روش قائم نہ رکھ سکے، اس وجہ سے شاعری کا مزاج اور رنگ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ کلام میں معائب وسیع طور پر دیکھنے میں آرہے تھے اور محاسن ناپید۔۔۔ امداد علی، بحر، منیر شکوہ آبادی، ارشد علی خاں قلق، مظفر علی اسیر ان شعرائے متاخرین کے ہاں شاعری کا رنگ پھیکا نظر آتا ہے۔ ان شعراء کے کلام میں نہ تو کوئی جان نظر آتی ہے اور نہ ہی فکری آنچ کا پتہ چلتا ہے۔ ہاں البتہ تسلیم لکھنؤ کے تھے مگر رنگ شاعری دہلی کا اپنایا تھا۔

لکھنؤ میں جو شعراء مقیم تھے ان میں نمائندہ شاعر امیر مینائی، جلیل، مضطر، قائم، ریاض خیر آبادی اور تلامذہ وغیرہ، ناسخ کے شاگردوں میں سب سے اہم نام علی اوسط رشک کا ہے۔ انہیں استاد نے یہ اعزاز عطا کیا تھا کہ وہ ناسخ کے شاگردوں پر اصلاح بھی دیا کریں۔ زبان کی اصلاح میں جو قانون اور قواعد ناسخ نے مرتب کیے تھے، ان کی مکمل تقلید ہمیں رشک کے ہاں ملتی ہے اور اپنے استاد کے کام کو آگے بڑھانے میں بھی رشک آگے آگے تھے۔ اپنے کلام میں اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ کہیں کوئی متروک الفاظ شاعری میں داخل نہ ہونے پائیں۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ لکھنوی زبان کی صحت درکار ہو تو رشک کا دیوان ہی کافی ہے۔ لکھنؤ کی خاص فضا اور ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھنوی طرز پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کے کلام میں واردات قلبی

کے نمونے بڑے جاندار اور مستحکم نظر آتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں عہد کی عکاسی کے ساتھ زبان کو نکھارنے کا عمل بھی تیز نظر آتا ہے۔

رشک کے کلام میں رنگینی اور چاشنی نام کو نہیں، بس ایک نظریے کے تحت شاعری کرتے تھے۔ ان کے ہاں جو لفظ جیسے بولا جاتا ہے، اسے اسی طرح وہ نظم بھی کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں لفظ کا صحیح استعمال ہی لفظ کی معراج ہے۔

لکھنؤ کا آخری چراغ ضامن علی جلال، رشک کے شاگرد تھے انہوں نے بھی زبان کی اصلاح پر کافی زور دیا۔ اسی لیے ان کے کلام میں دلآویزی اور چاشنی پیدا نہ ہوسکی۔ کلام میں فرسودہ مضامین نام کو نہیں۔ تصنع و تکلف سے بھی گریز کرتے تھے۔ الفاظ و محاورات پر قدرت رکھتے تھے۔ جلال عروض و فن پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

اسی طرح لکھنوی تہذیب اور معاشرت کی عکاسی محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی کی شاعری میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے کلام میں تشبیہات و استعارات رعایت لفظی، کلام میں شوخی بھی کچھ موجود ہے مگر متانت اور جاذبیت نظر نہیں آتی۔ ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ لکھنوی شعراء ناسخ اور رشک کے تتبع میں لکھنوی رنگ کے شیدا رہے۔ غزل اور قطعات میں لکھنوی رنگ اجاگر ہوا ہے۔ زیادہ تر غزلیں ان کے دیوان میں طویل ہیں۔ ایک غزل میں ستر اور پچھتر اشعار کہنے کی عادت تھی۔ بہت سے اشعار تو فحش نگاری اور عامیانہ نظر آتے ہیں۔ کلام میں کوئی دلآویزی نہیں۔ پھیکی اور بے مزہ شاعری جس میں صرف تشبیہات اور استعارات کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ منیر ایک پرگو شاعر تھے۔ ایک یہی نہیں زیادہ تر شعراء پر لکھنوی تہذیب کا اثر ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت پر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے۔

''نسائیت اور فحش نگاری سے مل کر ریختی کی بنا پڑی، یہ ایسی صنف ہے جو اردو کے سوا دنیا کی کسی اور زبان کی شاعری میں موجود نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ کچھ کچھ ہندی شاعری سے ملتا ہے کیونکہ ہندی شاعری میں بھی عورتوں کے جذبات انہی کے محاورہ میں ادا کیے جاتے

ہیں۔ لیکن ریختی میں صرف عورتوں کی زبان کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے بلکہ پیشہ ور عورتوں کے مبتذل جذبات، بازاری اور عامیانہ زبان میں ادا ہوتے ہیں۔"

تسلیم کا رنگ شاعری معاصرین میں کچھ زیادہ جاندار نہیں۔ نسیم کے شاگرد تھے وہ اپنے کلام میں شیرینی، پر کیف لطافت اور زبان بہت میٹھی استعمال کرتے تھے۔ طبیعت میں بے پناہ عجز و انکسار تھا۔ ان کا بیکہ خلوص اور محبت ان کے اشعار میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ان کے تین دیوان منظر عام پر آچکے ہیں۔ (۱) نظم ارجمند (۲) نظم دل افروز (۳) دفتر جمال

۔ ان کے مضامین میں عامیانہ پن اور ابتذال قطعی نہیں۔ ان کے ہاں معشوقانہ طرز ہے اور نہ ہی محبوب کی باتیں۔ مختصر بحروں میں سادگی کو اپناتے ہوئے رنگ دہلی میں فکر و جذبہ سے شاعری کے دامن کو وسیع کیا ہے۔

مظفر علی اسیر کی شاعری پر کسی دبستان کا لیبل نہیں وہ اس لیے کہ ان کی شاعری میں کسی قسم کا کوئی رنگ ظاہر نہیں ہوا۔ بے کیف اور بے مزہ شاعری، اس دور کے لحاظ سے اسیر کی شاعری میں نہ تو نسائیت ہے اور نہ معاملہ بندی، اسی لیے انہیں وہ شہرت تو نہ مل سکی جو ان کے معاصرین کے حصہ میں آئی، ہاں البتہ ان کے شاگرد امیر مینائی نے استاد کے نام کو ایک اعتبار بخشا۔ رام پور کی محفلیں اور صحبتیں جس میں برابر شریک ہوئے لیکن ان کی شاعری پر کسی کے اثرات نہیں پائے جاتے۔ ان کی شاعری داخلی احساسات کی ترجمان ہے۔ ان کی علمی قابلیت کثیر تصانیف سے بھی ظاہر ہے۔ ان کی وجہ شہرت ان کے اپنے شاگرد ہیں جن میں امیر مینائی، احمد علی شوق اور ریاض خیر آبادی۔ اسیر صاحب فن شاعر تھے۔ شعرائے متاخرین میں رشک، اسیر، شوق، امیر، جلال، نسیم منیر اور تسلیم ان کے علاوہ مرثیہ کی صنف میں انیس و دبیر نے مرثیہ کو منتہائے کمال پر پہنچا دیا۔ لکھنوی تہذیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی شاعری کا ابلاغ اور اس کا فروغ اس عہد کی عکاسی کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی شعرائے متاخرین کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"متاخرین شعرائے دلی کا رنگ متقدمین سے مختلف تھا۔ اپنے ذوق کے مطابق انہوں نے بھی

زبان میں تراش خراش کی اور محاورہ کو ایسا درست کیا کہ اب تک اس میں بہت کم فرق آیا ہے لیکن ان کے خیالات بھٹکنے لگے اور جذبات عشق میں عشق حقیقی اور پاک و بے لوث الفت کے خیالات ترک کر کے ہوس پرستی کے جذبات نظم کرنے لگے۔ جرأت، انشاء اور رنگین نے اس کی ابتداء کی اور چونکہ یہی شعراء اگلے دور میں نمونہ بنے اس لیے جو زہر ان لوگوں نے اگلا تھا، وہ تھوڑے ہی عرصہ میں شعروادب کے سارے جسم میں سرایت کر گیا۔ انہی لوگوں نے ریختہ کے ساتھ ریختی اختیار کی۔ جس کے بعض نمونے پہلے بھی تھے لیکن ان میں وہ بے شرمی اور ہوسناکی نہیں جو رنگین اور انشاء سے شروع ہوئی اور لکھنؤ پہنچ کر فن بن گئی۔''

دبستان لکھنؤ کی شاعری میں رنگینی، رعایت لفظی، خارجی مضامین اور عورتوں سے متعلق مواد زیادہ ملتا ہے حتیٰ کہ ان کے لباس اور زیورتک کو شاعری کا حصہ بنا دیا گیا۔ لکھنوی شعراء نے جن چیزوں کا اہتمام کیا ہے وہ کچھ یوں ہے آرائش جمال، لکھنوی محبوب، معاملہ بندی، زبان کا خیال، تصوف سے گریز، نئی زمینیں نکالنا اور رعایت لفظی کو شعری پیکر میں ڈھالنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں ابتذال کا دخل زیادہ رہا۔ محسن کاکوروی کی شاعری ان شعراء سے مختلف ہے کیونکہ وہ نعت کہتے تھے۔ محسن پہلے نعت گو شاعر ہیں جنھوں نے اسے فن کی حیثیت سے نوازا اور مذہبی عقیدت کی وجہ سے محبت، شیفتگی اور والہانہ عشق کے طور پر اشعار میں اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

امیر مینائی کی ولادت ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ عربی فارسی زبان پر عبور تھا۔ منشی مظفر علی اسیر سے کلام پر اصلاح لی۔ طبیعت کی روانی اور زود گوئی سے اپنے استاد سے بھی زیادہ نام کمایا۔ واجد علی شاہ کے دربار میں جب ان کا تذکرہ ہوا تو انہیں بلا کر ان سے کلام سنا، کلام کو پسند کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ انہی کے کہنے پر دو کتابیں ''ارشاد السلطان'' اور ہدایت السلطان'' لکھیں۔ ان کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف اور شعروشاعری میں گزرتا۔ شاعر تو اچھے تھے ہی ایک اچھے عالم بھی تھے، اس لیے لوگوں کی نگاہ میں عزت و تکریم بہت زیادہ تھی۔ ان کا پہلا دیوان ''مرآۃ

الغیب" ہے۔ اس میں کوئی خاص کمال یا رنگ ابھر کر نہیں آیا۔ دوسرے دیوان "صنم خانہ عشق" میں پختگی بھی ہے اور چاشنی بھی۔ ابتدائی کلام میں بے جا رعایت لفظی، ابتذال، بھدّی تشبیہیں، عورتوں کی باتیں، کنگھی چوٹی کا ذکر ملتا ہے یعنی وہی پرانے مضامین جو کئی بار دہرائے گئے ہیں۔ دوسرے دیوان "صنم خانہ عشق" میں علوِ تخیل، سلاست روانی اور دلکش عاشقانہ ترکیبیں بکثرت موجود ہیں۔

ان کے کلام میں فصاحت، بلاغت، جوش، نزاکت خیال، بلند پروازی، شیرینی، زورِ بیان اور تصوف کی چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ امیر مینائی نے لکھنوی شاعری کو قدیم روایات اور بے جا بندشوں سے آزاد کرایا۔ انہوں نے ایسے رنگ کی بنیاد ڈالی جس پر ان کے تلامذہ ریاض خیر آبادی، مضطر اور قائم نظر آتے ہیں۔ "صنم خانہ عشق" کے بارے میں امیر مینائی خود لکھتے ہیں۔

پچھلا کلام بھی ہے جو اس میں شریک امیر　　　دیواں میں اب کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں

امیر مینائی نے وقت کی رفتار کو حال کے آئینے میں دیکھ اور وقت کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے شعری آہنگ کو بدلنے پر مجبور ہوئے۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام بھی ان کی اس کاوش کی نشاندہی کرتے ہیں۔ "جوہر انتخاب"، "گوہر انتخاب" اور صنم خانہ عشق" میں عاشقانہ مضامین "مراۃ الغیب" کی نسبت کثرت سے نظر آتے ہیں۔

انہیں ہر صنف سخن پر کامل دسترس حاصل تھی۔ ان کے حریف بھی ان کی شاعری کے قائل تھے۔ لکھنؤ کا خاص مزاج جس میں چوما چاٹی، عامیانہ طرز فکر اور ایسی بہت سی مثلیں جو لکھنوی شاعری کا امتیاز سمجھا جاتا تھا، امیر مینائی نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ لیکن داغ اور نظام کی صحبتوں نے امیر کو نئے آہنگ کا شاعر بنا دیا۔

دبستان لکھنؤ کا آخری چراغ ضامن علی جلال، رشک کے شاگرد تھے۔ انہوں نے بھی زبان کی اصلاح پر کافی زور دیا اسی لئے ان کے کلام میں دلآویزی اور چاشنی پیدا نہ ہو سکی۔ کلام میں تصنع و تکلف جیسے مضامین قطعی نہیں۔ الفاظ و محاورات پر قدرت رکھتے تھے۔ معاصرین کی صحبتوں کے اثر

سے کلام میں جان اور چاشنی نظر آنے لگی۔ طبعاً اور مزاج کے حوالہ سے جلال اپنے برابر کسی کو نہ گردانتے تھے۔ مغرور اور انا پرست انسان تھے۔ اپنے معاصرین کے کلام میں عیب نکالنا اور تنقید کا نشانہ بنانا ان کا مشغلہ تھا۔ ایک طرف ان کے یہ معائب تھے تو دوسری طرف وہ اپنے تلامذہ سے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ جلال کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں قواعد اور محاورہ کا خیال رکھتے تھے۔ یوں تو وہ ایک منجھے ہوئے استاد تھے۔ جلال عروض پر بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شاعری میں چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ لکھنوی رنگ سخن میں دہلوی شعراء کا بڑا دخل رہا لیکن اس کے باوجود لکھنؤ کا اپنا رنگ شاعری تھا۔ دراصل لکھنؤ کے دبستان شاعری کی بنیاد انشاء، مصحفی اور جرأت کے ہاتھوں رکھی گئی۔ یہ وہ شعراء ہیں جن کا تعلق دہلی سے ہے۔ اس وقت ان شعراء کے ہاں سنگلاخ زمینیں، معاملہ بندی اور نسائیت کے مضامین باندھے گئے۔ یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ شجاع الدولہ کے عہد میں حسین عورتوں کا دخل دربار میں زیادہ رہا۔ اس لیے شاعری میں نسائیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا۔ دہلی کی شاعری میں سوز و گداز اور تصوف کا ملا جلا رجحان ملتا ہے۔ کیونکہ دہلی کے اجڑنے سے لوگوں کی حالت زار عبرت کا نشان بنتی جا رہی تھی۔ یہ شعراء لکھنؤ پہنچ کر سکون و اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور اس سکون کی دولت سے فیضیاب ہو کر حسن پرستی، مادی عشق اور معاملہ بندی جیسے مضامین شاعری میں جگہ پانے لگے۔ عشق مجازی کی واردات و کیفیات والے مضامین میر جعفر علی حسرت کے کلام میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ آتش و ناسخ کے شاگردوں نے لکھنؤ کے رنگ شاعری کو سنبھالے رکھا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنوی شاعری کا رنگ ان شعراء کے ہاتھوں قائم ہوا۔

رند، صبا، رشک پھر ان کے بعد بحر، قلق، جلال وغیرہ نے اس رنگ کو جلا بخشی۔ اس دور میں اصناف سخن کے اعتبار سے بھی شاعری میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے مرثیے، نسیم کی مثنوی، معرکے کی غزلیں، قصیدے، رباعیات وغیرہ، سبھی کچھ کہہ رہے تھے۔

اسیر، جلال، بحر کے شاگردوں نے لکھنو کے رنگ شاعری کو تقویت دی۔ ان کے بعد زمانہ نئے تقاضوں کے لیے کروٹ بدل رہا تھا۔ دبستانوں کی آوازیں ماند پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن ان دبستانوں کے اثرات مستقبل کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی کی شاعری کا مطالعہ کریں تو تغیر کا یہ عمل ہمیں ان کی شاعری میں صاف نظر آئے گا۔

دیگر دبستانوں کی طرح لکھنو کا دبستان بھی ایک کامیاب دبستان تھا۔ اس دبستان میں بھی سربرآوردہ شخصیات کے نام آتے ہیں۔ اس دبستان کا ہر شاعر ایک ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔

دبستان رام پور:

دہلی اور لکھنو کے اجڑنے سے شاعری کی بساط الٹ گئی اور شعراء دل برداشتہ ہو کر مختلف شہروں کی طرف نکل گئے۔ دہلی اور لکھنو کے بہت سے شعراء ریاست رام پور پہنچے، جن میں داغ، امیر مینائی، تسلیم، جلال، منیر شکوہ آبادی وغیرہ۔ نواب یوسف علی خاں ادباء، علماء اور شعراء کا پہلے ہی قدرداں تھا اور ایسے بھی شعراء تھے جنہیں خاص طور پر رام پور آنے کی دعوت دی گئی۔ اس طرح یوسف علی خاں کی سرپرستی میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ لکھنوی اور دہلوی رنگ آپس میں مدغم ہو گئے اور ایک نئے رنگ کا اظہار ہونے لگا۔ نواب یوسف علی خاں خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ مومن خاں مومن کو اپنا کلام دکھاتے تھے مومن کی وفات کے بعد غالب سے اصلاح لی اور آخر میں مظفر علی اسیر کو اپنا کلام دکھایا۔ نظام تخلص کرتے تھے۔ یوسف علی خاں صاحب دیوان شاعر تھے۔ انہوں نے شعراء و ادباء اور اہل فن کی جو قدردانی اور عزت افزائی کی اس سے ان کی فیاضی کا پتہ چلتا ہے۔ زیادہ تر شعراء آسودہ حال ہو گئے۔ شعراء زیادہ تر غزلیں کہہ رہے تھے اور اپنی اپنی افتادِ طبع سے نئے نئے مضامین اور اختراعیں تراش رہے تھے۔ دبستان رام پور کا اپنا ایک خاص رنگ تھا جو یوسف علی خاں کے عہد میں شباب پر تھا۔

نواب یوسف علی خاں کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے کلب علی خاں ۱۸۶۵ء میں مسند نشین ہوئے۔ یہ خود بھی شاعر تھے اور اپنے والد کی طرح ارباب فن کی قدر و منزلت کرتے

تھے۔ انھوں نے امیر مینائی سے کلام پر اصلاح لی۔ مولانا فضل حق سے درسیات معقول و منقول پڑھی تھی۔ فارسی میں ان کا دیوان "تاج فرخی" کے نام سے مشہور ہے۔

ان کے چار دیوان اردو میں شعری ذوق کا اظہار ہیں۔ کلب علی خان "نواب" تخلص کرتے تھے۔ رام بابو سکسینہ کلب علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ان کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا اور الفاظ کی صحت و عدم صحت کے مناظرے ان کے سامنے اکثر ہوا کرتے تھے جن میں بحر، تسلیم، جلال، امیر اور منیر وغیرہ جو اس فن خاص میں بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے، نمایاں حصہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے نواب صاحب کا بیشتر کلام متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں سے پاک ہے۔"

نواب کلب علی خاں طبعی میلان کے تحت تحقیق لفظی کے شوق کی تکمیل اور محاوروں کا صحیح استعمال اور مناسب الفاظ کے لیے غور و فکر میں ڈوب جاتے کیونکہ وہ دور از کار تراکیب اور الجھی ہوئی گفتگو کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ زبان میں سادگی اور پرکاری کے قائل تھے۔ اصلاح زبان اردو کے سلسلہ میں ان کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔

رام پور میں شعراء کو جہاں ٹھہرایا جاتا ہے "مصاحب منزل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مصاحب منزل میں ہی شعراء جمع ہوتے اور یہیں نواب رام پور مشاعرے میں شرکت کرتے۔ اس عمارت کا نام نواب نے اپنے ان شعراء کی نسبت سے رکھا جنھیں وہ عزیز رکھتا تھا۔ اس مجلس میں جو شعراء شریک ہوتے تھے ان میں داغ، تسلیم، امیر مینائی، بحر، جلال لکھنوی۔ یہ تمام شاعر اپنے اپنے فن میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ نواب کی صحبت خاص اور مقامی شعراء کے رنگ سے جو رنگ ابھر کر سامنے آیا وہ معاملہ بندی کا ہے۔ لکھنوی اور دہلوی شعراء نے مقامی رنگ کو اپناتے ہوئے ایک نئے رنگ کو اجاگر کیا۔ مقامی شعراء میں علی بخش بیمار، سید احمد رسا، نظام رامپوری، محمد مظفر خاں گرم، مولوی محمد حیات خاں حیات، صاحبزادہ مہدی علی خاں نحیف وغیرہ۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کلب علی خاں کے زمانے میں جو ادبی ترقی ہوئی ہے اس کی مثال

کسی اور ریاست میں نہیں ملتی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ نواب کی علم پروری اور ارباب فن کی قدر و منزلت علمی ترویج میں اضافہ کا باعث بنی تو دوسری طرف یہ ذوق عوام میں منتقل ہوا، عوام کی دلچسپی میں بے حد اضافہ ہوا، مشاعروں کا اہتمام ہونے لگا۔ ان مشاعروں سے ریاست میں ایک ادبی فضا پروان چڑھنے لگی اور اس سے یہ فائدہ ہوا کہ معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی فضا سے خوشگوار اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے۔ مختلف افکار و خیالات کے ذہن جب "مصاحب منزل" میں جمع ہوئے تو ایک نئی فکر، ایک نیا رنگ اور ایک نئے طرز شاعری کی بنیاد پڑی، جس کی بنیاد یوسف علی خاں نے رکھی تھی اور اس میں ترقی اور فروغ کلب علی خاں کے زمانے میں ہوا۔ ان کا دور خصوصاً شعر و ادب کا سنہری دور تھا۔ ۱۸۷۷ء میں کلب علی خاں کی موت واقع ہوئی تو رام پور کی یہ ادبی بساط بھی لٹ گئی۔ یہاں پر شعراء ادباء اور دیگر فنون کے اہل کمال آسودگی سے زندگی گزار رہے تھے۔

دبستان رام پور کا اپنا خاص رنگ جو یوسف علی خاں کے عہد میں شباب پر تھا، اس رنگ کو دو آتشہ کرنے والا شاعر نظام رامپوری تھا۔ شوخی، معاملہ بندی، معشوقانہ اداؤں کا ذکر، ہجر و وصال کی کیفیات، یہ سب خصوصیات نظام کی شاعری کا خاصہ تھیں۔ نظام نے شاعری میں مصوری کی ہے۔ محاکاتی رنگ ابھر کر آیا ہے۔ تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ نظام کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ ۔۔۔ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام ۔۔۔ منہ پھیر کے ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

یہ ہے وہ رنگ شاعری جو رام پور کے گلی کوچوں اور ایوانوں میں گونج رہا تھا جبکہ داغ بھی اسی نوع کی شاعری کر رہے تھے۔ مگر یہ خوبی اور شوخی نہ پیدا کر سکے جو نظام کے ہاں نظر آتی ہے۔ "مہتاب داغ" اور "آفتاب داغ" کا مطالعہ کر لیں اس میں ان کا طبعی میلان ظاہر ہوا ہے لیکن رام پور آنے کے بعد یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر "یادگار داغ" مرتب کی۔ اس میں خالصتاً رام پور دبستان کا رنگ ہے۔

غالب نے نظام کے متعلق کہا تھا کہ نظام رام پور کا "میر" ہے لفظ میر غالب نے بہت صحیح غور وفکر کے بعد نظام کو تفویض کیا کیونکہ میر کی تمام زندگی رانج وغم میں بسر ہوئی۔ نظام کی زندگی بھی رنج وغم مصائب وآلام میں ڈوبی ہوئی تھی۔

داغ نے اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا بلکہ تسلیم بھی کیا کہ رام پور میں نظام سے بڑا شاعر کوئی اور نہیں۔ داغ نے نظام کی تقلید کرتے ہوئے اپنی شاعری کے رخ کو موڑ دیا۔ رام پور میں ابلاغ شعری، شعری اقدار، جدت طرازی، شوخی بیان اور زبان کی سادگی و پرکاری سے روزمرہ کے الفاظ اور محاورے کی بندش سے شاعری میں نیا رنگ ظاہر ہوا۔ اس نئے رنگ میں زبان کی صفائی، محاورات کا صحیح استعمال جنسی میلان، عشق ونشاط کا رنگ اور عیاشانہ طرز زندگی کے نقوش شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ داغ نے رام پور میں جو شاعری کی اس سے اردو زبان میں جو وسعت نظر آتی ہے وہ ان کے دواوین سے ظاہر ہے۔

ایک مثنوی "فریاد داغ" کے نام سے لکھی۔ مثنوی میں ایک طوائف کے عشق میں اپنی سرگزشت لکھی ہے۔ اسی لیے حالی نے "مسدس حالی" میں داغ کا نام لئے بغیر ان کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ دراصل حالی نے اس وقت کی شاعری پر تنقید کی ہے۔ شاعری میں ایسے ہی موضوعات کا رجحان عام تھا۔

طوائف کو ازبر ہیں دیوان ان کے — گویوں پہ بے حد ہیں احسان ان کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان ان کے — ثنا خواں ہیں ابلیس و شیطان ان کے
کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال انہوں نے — ہمیں کر دیا فارغ البال انہوں نے

نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد رام پور کی یہ ادبی وشعری بساط بھی ختم ہوگئی اور ایک بار پھر شعراء منتشر ہونا شروع ہوئے۔ رام پور کی محفلیں اجڑنے کے بعد شعراء نے حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔ یہاں والی ریاست میر محبوب علی خان کی سرپرستی میں پھر سے شعروادب کی محفلیں آباد ہوگئیں۔

پروین صادق (متحدہ عرب امارات)

اردو ادب میں رومانی تنقید کا ارتقاء

رومان " Romance" یا "Romana" کا مفہوم عرصہ دراز تک متنازعہ فیہ رہا ہے۔ کیونکہ مختلف ادوار میں اس کی تعریف مختلف انداز میں ہوتی رہی۔ ابتداء میں عشق و محبت کے قصوں کو رومان سے منسوب کیا جاتا رہا، جو کہ قطعی درست نہیں۔ دراصل رومانیت جسے انگریزی میں (Romanticism) کہا جاتا ہے، ایک مخصوص طرز فکر اور زاویہ نگاہ کا نام ہے۔[1]

ادب میں لفظ "رومانیت" کو بطور اصطلاح استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے ادب کی تخلیق جس میں عقل سے زیادہ جذبہ کی کارفرمائی ہو، رومانی کہلائے گا۔ ماضی کے پرشکوہ واقعات کو بھرپور جذبے سے بیان کرنا بھی رومانی ادب کی ذیل میں سمجھا جاتا ہے۔ "رومانیت کا تعلق چونکہ شعور کی بجائے لاشعور سے ہے اس لیے یہ ایک بے حد پیچیدہ نفسیاتی کیفیت ہے لیکن اس کی اب تک کوئی جامع تعریف مرتب نہیں ہو سکی۔"[2]

۱۷۸۱ء میں ادبیات میں وانٹن نے یہ لفظ "رومان" سب سے پہلے استعمال کیا۔ اس کے بعد گوئٹے اور شلز نے ادبیات میں اس کو جگہ دی۔ اور رفتہ رفتہ یہ لفظ اصطلاح کے طور پر ادب میں رائج ہو گیا۔ "جہاں تک لفظ رومانی کا تعلق ہے اس کے استعمال میں بڑی احتیاط لازمی ہے۔ رومانی کیفیت کسی نہ کسی صورت میں ہر دور میں پائی جاتی ہے۔ دماغی نیم بیداری کے لمحے، بے نام جذبات، محبت بھرے تجربے یہ سب رومانی چیزیں ہیں۔ لیکن رومانی تحریک ایک متعین چیز کا نام ہے جو فکر، ادب اور فن کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً ایک وسیع پیمانے پر ظہور پذیر ہوئی ہے۔"[3]

رومانی تحریک کا تمام تر ڈھانچہ مغرب کی رومانی تحریک اور اثرات کا رہین منت ہے کیونکہ مغرب میں رومانیت کی ابتدا ایک ایسے ذہین شخص سے منسوب کی جاتی ہے جس کی ذہانت کو اس کے عصر نے تسلیم نہ کیا۔ اس نابغہ ہستی کا نام روسو (Rousseau) ہے۔ روسو کا خیال تھا کہ:

"علم انسان کو بہتر بنانے کی بجائے چالاک بنا دیتا ہے۔ فلسفہ اخلاقی طور پر بیمار اور شعور سے محرومی کے احساس سے دوچار کرتا ہے۔ تخیل کی قوت عقل پر بہر حال فوقیت رکھتی ہے۔"[1]

روسو کے یہ خیالات انقلابی تھے اور اس کی یہ مستور آواز:

" Man is born free but now everwhere he is in chains "

بلند ہوئی تو اسے رومانیت کا مطلع اول قرار دیا گیا۔ یوں ادیب معاشرے کا انعکاس کرنے کی بجائے معاشرے کو اپنی داخلی آوازوں کے مطابق منقلب کرنے کی کوشش کرنے لگا اٹھارویں صدی میں جب کلاسیکی تحریک نے فرد کے جذبات کو مقید کر دیا تو ایسے میں تخلیقی ابال جو زندگی کو تنوع عطا کرتا ہے پابندیوں کے باعث اخراج کا فطری راستہ نہ پا سکا۔ اس جامد اور پابند فضا میں ادب کی رومانی تحریک ابھری۔ انگلستان میں ورڈز ورتھ اور کولرج نے شاعری اور تنقید کا آغاز کیا اور ان ہی کو رومانیت کی ادبی تحریک اور رومانی تنقید کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ان دونوں کے اشتراک میں ۱۸۰۱ء میں "Lyrical Ballads" طبع ہوئی۔ اس کے پیش لفظ میں ورڈز ورتھ نے جن خیالات کا اظہار کیا وہی اس تحریک کا منشور اور رومانی تنقید کی اساس قرار پائے۔ ورڈز ورتھ کے مطابق شاعر کو صرف خود پر ایک پابندی عائد کرنی چاہیے اور وہ یہ کہ اس کی شاعری قاری کے لیے فوری مسرت کا باعث بنے۔ الغرض مسرت، حسن اور جذبات رومانیت کی اساس قرار پائے۔ دراصل رومانیت اس داخلی قوت کا نام ہے جو نامعلوم کو دریافت کرنے اور نئی شے کی تخلیق پر آمادہ کرتی ہے کلاسیکیت جس محرک قوت کو خارج سے تلاش کرتی ہے رومانیت اس قوت کو انسان کے داخل سے برآمد کرتی ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جب انگریزی کو تدریس کا مستقل جزو بنا دیا گیا تو ہندوستانی نوجوانوں کو مغرب کے رومانی شعرا کے براہ راست مطالعے کا موقع ملا۔[2] اس طرح پرانی روایات واقدار کے خلاف نوجوان نسل کا ردعمل رومانی تصورات کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے رومانیت کے فروغ کی ایک اہم وجہ دنیائے سائنس کی صورت حال میں تلاش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بیسویں صدی میں۔۔۔ علوم کی ترقی نے انسان کے سارے تیقن کو پارہ پارہ کر دیا اور

اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ مرکز کائنات نہیں رہا۔۔۔ اور ماحول کے ساتھ اس کا رشتہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ جب وہ بنیاد ہی لرزہ براندام ہو جس پر معاشرے کی عمارت کھڑی ہو تو انسان قدرتی طور پر متخیلہ کو بروئے کار لاتا ہے تاکہ ایک بہتر اور خوب تر جہاں کا نظارہ کر سکے۔

بیسویں صدی میں فرد کی یہ بے بسی رومانیت کے فروغ میں خاصی معاون نظر آتی ہے، اور یہ کہنا درست ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر میں ایسی فضا مرتب ہو چکی تھی جس میں رومانیت پھل پھول سکتی ہے۔ اس دور میں جو ادبا "مخزن" کے صفحات سے نمایاں ہوئے ان میں اقبال، ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، آغا شاعر قزلباش، ظفر علی خاں، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ، مہدی افادی، لطیف احمد، خواجہ حسن نظامی اور شیخ عبدالقادر کے اسماء بے حد اہم ہیں۔ ان ادبا نے اردو زبان کو خاص قسم کی لطافت سے آشنا کیا اور طاقتور متخیلہ کے بل پر رومانی تصورات کو فروغ دینے کی سعی کی۔

تنقید میں رومانیت کا در آنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا۔ تاہم اگر نقاد کا طرز احساس رومانی ہے اور وہ فن پارے کا سائنسی تجزیہ کرنے کی بجائے اس کی مابعد الطبیعات میں جھانکنے اور تخلیق کے وجدانی عمل سے فن پارے کے باطنی مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کا آرزومند ہے تو اس کے تنقیدی عمل پر رومانیت کا غالب آجانا عین ممکن ہے۔ اردو میں تنقید کا آغاز حالی کے عہد آفریں کارنامے "مقدمہ شعر و شاعری" سے ہوتا ہے بلا شبہ انجمن پنجاب کے جلسوں میں محمد حسین آزاد نے جو مضامین پڑھے ان میں ایک سلجھے ہوئے نقاد کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور "آب حیات" اسی نقاد کی ایک حیات آفریں کتاب ہے تاہم آزاد نے تنقید کے اصول و ضوابط مرتب نہیں کیے۔ یہ کام احسن طریق پر حالی نے سرانجام دیا اور اردو تنقید کو نئی بوطیقا عطا کر دی۔

حالی نے اردو تنقید کا معیار وضع کیا لیکن ان کی تنقیدوں کے پیمانے خاصے تنگ تھے اور اس کے خلاف اولین ردعمل رومانی تحریک کے ہراول کے ادیب مہدی افادی کی طرف سے ہوا اردو تنقید کا انحصار بالعموم انگریزی نظریات اور ان سے وابستہ اصطلاحات کی جگالی پر ہے۔ اس لیے

اردو تنقید میں رومان اور رومانی ایسی اصطلاحات نے کافی الجھنیں پیدا کی ہیں۔ اس لیے اختر شیرانی شاعر رومان ہے تو یلدرم رومانی افسانہ نگار ہے جب کہ نیاز فتح پوری رومانی نقاد کہلاتے۔ رومانی تنقید عبدالرحمٰن بجنوری، مجنوں گورکھپوری عبدالماجد دریا آبادی، عبدالقادر سروری، نیاز فتح پوری اور مہدی افادی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ ان ناقدین کی تنقیدیں اردو ادب کا خوبصورت سرمایہ ہیں۔ ان کی بدولت جس طرح کی تنقید وجود میں آئی اس کا محققانہ جائزہ لینے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان خصوصیات کا جائزہ لیا جائے جو مغربی رومانی تنقید کا خاصہ تھیں، جن کے پیش نظر ہمارے رومانی ناقدین نے اردو ادب کو تنقیدی سرمائے سے سیراب کیا۔ رومانی تنقید کی سب سے اہم خصوصیت انفرادیت ہے کیونکہ رومانیت پسندوں نے سماج یا حکومت کی اصلاح سے زیادہ افراد کی اصلاح کو مدنظر رکھا۔ وہ ایسی سوسائٹی کے خواہاں تھے جس میں ہر قسم کی سیاسی اور معاشرتی آزادی حاصل ہو۔ اس کے ساتھ ہی رومانی فلسفہ نے عقلیت کی بجائے جذبات و احساسات کی برتری کا دعویٰ کیا۔ رومانیت پسندوں کا قول تھا کہ سماج میں مذہب، حکومت اور دوسری پابندیوں سے انسان کا گلا گھٹ کر رہ جاتا ہے چونکہ کلاسیکی طریق معاشرت میں جذباتیت کو انسانی شخصیت کا وحشیانہ اظہار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے نئی آزادی کی رو میں جذباتیت کے آزادانہ اظہار کو کلاسیکی اعتدال پسندی پر ترجیح دی گئی۔ رومانی تنقید میں فطرت پسندی یا فطرت پرستی کی جھلک واضح طور پر نمایاں ہے۔ انسان دوستی کا جذبہ اپنے عروج پر ہے، سیاسی حد تک رومانی شاعروں نے غلام ملکوں کی بے بسی پر آنسو بہائے اور ان کی آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ ورڈز ورتھ نے لکھا ہے کہ:

"ہم شعراء جوانی میں مسرت سے ابتدا کرتے ہیں لیکن بالآخر مایوسی اور ہذیان ہوتا ہے۔"

یہ الفاظ اس کرب کے مظہر ہیں جس سے رومانی فنکار دوچار ہوتا ہے چنانچہ لوکس (Lucas) نے رومانیت کو پرستان کے ایسے شہزادے سے تشبیہ دی ہے جو حسن خوابیدہ کی تلاش کر رہا ہے اور اس کے تھکے ماندے جسم کو الف لیلیٰ کی خیالی شہزادی سکون مہیا کرتی ہے۔[۲]

لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو زندگی کی بے رحم حقیقتیں مایوسی اور نامرادی سے دوچار کر دیتی ہیں۔

جہاں تک ادبی تنقید کا تعلق ہے رومانی تنقید نے ادب کو صرف سماجی مفاہیم اور افکار کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اس کے حسن و جمالیاتی کیف پر بھی زور دیا ہے۔ وہ الفاظ کے پیکر میں معنی کی تلاش کرنے کی بجائے ان کی مدد سے ماورا تک پہنچنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی نظر چیز کے مادی وجود اور اصل معنی کی بجائے اس کی مدد سے فردوس گم گشتہ کے نشانات کی طرف جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا ہتھیار لغت، شعرفہمی یا سماجی علم نہیں بلکہ جذبہ اور وجدان ہے جو بقول کانٹ اسے عالم معقول (Sensible سے فوق المعقول (Supersensible) تک لے جاتی ہے۔ [۳]

مہدی افادی نے تنقیدی عمل میں اس مسرت کو تلاش کرنے کی سعی کی جسے ادبا نے اپنے تخلیقی پاروں میں جا بجا چھپا رکھا تھا اور فیصلے میں انشاء پردازی کو یوں استعمال کیا کہ ان کا فرمایا ہوا اب ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا۔ مثلاً ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''سرسید سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتا۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے۔ سوانح نگاری کے ساتھ تو چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد انشاپرداز ہیں۔ جن کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔'' [۴]

مہدی افادی اپنی تنقیدی رائے کے لیے وجدان کو ہی رہنما بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذوقی کیفیت نے ایک آزاد فضا تخلیق کی اور قاری کے دل کو مسخر کر لیا۔ مہدی تنقید میں آزادی اظہار کی اولین رومانی آواز ہے۔ انھوں نے رومانی طرز احساس کو بڑی خوبی سے تنقید میں استعمال کیا ہے۔ مہدی افادی کی تنقید میں لطافت زیادہ ہے لیکن گہرائی نہیں اس کے برعکس سجاد انصاری کی تنقید میں معنویت بھی ہے اور عمق بھی اور ان کی تنقید کی خوبی یہ ہے کہ وہ علم کی نمائش کے لئے بوجھل دلائل کے انبار نہیں لگاتے بلکہ مطالعے کی وسعت کو جملے میں اس طرح سمیٹتے ہیں کہ پھر کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ مہدی افادی اور سجاد انصاری دونوں محض خوش مذاقی کو ادبی تنقید کا

سنگ بنیاد سمجھتے ہیں۔ ان کی فکر کا ماخذ عربی اور ترک کی اساطیر ہیں ان کی نظر میں فن پارہ کی صداقت اور عدم صداقت میں پڑنے کی بجائے اس کی حسن کاری کو پرکھتی ہیں۔ مہدی اس اینگلو محمڈن کلچر کے اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ جس کی ترویج سرسید نے کی۔ مہدی کے مذاق میں مغرب کی ساری رومانیت یونانی مجسموں کی لاادریت Peganism اور مشرق کی محبت اور اس کی مذہبی اور رومانی روایات سے لگاؤ پایا جاتا ہے۔ ادبی تنقیدی ہو یا سیاسی مضامین ہر جگہ وہ ایک برطانوی لبرل کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ انگریزی اصطلاحات کو فارسی اور عربی کی مدد سے اردو کا لباس پہنانا اور مغربی مستشرق کے نقطۂ نظر سے یہاں کے ادب اور روایات سے لطف اندوز ہونا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

رومانی تنقید کا ایک اور روشن زاویہ عبدالرحمٰن بجنوری ہیں انھوں نے غالب کو والہانہ شیفتگی سے دریافت کرنے کی سعی کی۔ بجنوری ایک فطری رومانی کی طرح ان سرچشموں کو تلاش کرتے ہیں جن سے خود تخلیق کار کا ذوق سیراب ہوا تھا۔ چنانچہ بجنوری غالب کی خلوت میں جھانکنے اور اس کا فیض صحبت حاصل کرنے کی کاوش کرتے ہیں۔ ''محاسن کلام غالب'' سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ فن خارج کی کسی پابندی کو قبول نہیں کرتا بلکہ ایک آزاد فضا میں تخلیق ہوتا ہے۔ اور اپنی زبان خود وضع کرتا ہے۔ چنانچہ بجنوری شاعری کو حقیقت اور مجاز کے خانوں میں تقسیم کرنے کی بجائے برملا کہتے ہیں۔ شاعری انکشاف حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمو میں محدود نہیں اسی طرح شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔''

عبدالرحمٰن بجنوری کی اہم ترین تصنیف غالب پر ان کا ناتمام مقدمہ ہے۔ اس کا ایک اچھوتا جملہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک دیوان غالب دوسری وید مقدس۔''

اس ایک جملے میں رومانی تفریط پسندی جذباتیت اور چونکا دینے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔ ان کے فکر پر رومانی اثرات اور بھی کئی طرح واضح ہوتے ہیں۔ ''محاسن کلام غالب'' بجنوری کی تنقید کی مختصری کتاب ہے۔ اس میں بار بار جن شاعروں اور فلسفیوں کا تذکرہ آتا ہے وہ سب کے

سب یورپ کی رومانی تحریک سے متعلق رہے ہیں۔ ان میں شیلنگ ہائنے، شلز اور کانٹ، برگساں اور نطشے کے نام بار بار ملیں گے اور یہ تمام فلسفی اور ادیب وہ ہیں جنھوں نے عقل سے زیادہ جذبات اور وجدان کو حقیقت کے ادراک کے لیے کارآمد بتایا ہے۔ بجنوری ایک جگہ لکھتے ہیں:

"شاعرانہ جذبہ اور وجدان میں ایک ایسی کیفیت بھی واقع ہوتی ہے جس کو سرپرستی کے مترادف کہا جاسکتا ہے۔ جس میں شاعر آفتاب و مہتاب کو بے کف دست میں اٹھا لیتا ہے۔ اس بے خودی کے عالم میں مرزا نے کلام موزوں کیا ہے۔" [۳۶]

یہی نہیں ایک دوسری جگہ بجنوری نے غالب کو اپنے طریق فکر پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اپنے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ان کے کلام میں ایک ایسی مربوط اور فلسفیانہ فکر کا پتہ لگانا چاہا ہے جو ان کے کلام میں موجود نہیں ہے۔ غالب کی فکر پر روشنی پڑے یا نہ پڑے خود بجنوری کا طرزِ فکر ضرور ظاہر ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"غالب لفظ ہستی کو ہمیشہ مادے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں وہ مادے کے منکر ہیں عالم گو اجسام خارجی سے مملو نظر آتا ہے اور عائت لطیف غایات سے لے کر غایت گراں تک عناصر سے پُر ہے۔ مادے کا وجود محض بالنسبت ہے بالذات نہیں۔" [۳۷]

بجنوری نے رومانیت کا تصوراتی فلسفہ اختیار کیا۔ غالب پر ان کے مقالے میں غالب کے خارجی ماحول کا کوئی ہلکا سا عکس بھی نہیں ملتا۔ غالب کے فکر کی صداقت اور کمزوری پر ایک جملہ بھی نہیں ملتا۔ بجنوری نے رومانویت کے بنیادی فلسفے کو اپنایا۔ وجدان اور جذبے کو عقل و فہم سے برتر مانا۔ ان کے ہاں جذبے کی وہی فراوانی وہی طوفانی شدت اور افراط پسندی، مبالغہ آرائی اور کیف ساماں آراستگی پائی جاتی ہے۔ جو قدیم رومانوی داستانوں کا نشانِ امتیاز ہی ہوگی۔ [۳۸]

اردو نقادوں میں ڈاکٹر بجنوری پہلے نقاد ہیں جو یورپ کی کئی زبانیں جانتے تھے۔ جن کو مشرق و مغرب دونوں ادبیات سے واقفیت تھی اور جنھوں نے حصول تعلیم کے سلسلہ میں مغرب کا سفر کیا تھا۔ ان حالات نے ان کی تنقید پر گہرا اثر کیا ہے۔ مغرب نے ان پر یہ اثر کیا کہ وہ اپنی ملکی

چیزوں کو کم مرتبہ سمجھنے کی بجائے ان کو بلند مرتبہ سمجھنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ بجنوری کی تنقید میں چند تقابلی پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ لیکن اس کی نوعیت تاثراتی (Imprssionistic) ہے وہ سائنٹیفک نہیں۔ اس میں جذباتیت زیادہ نظر آتی ہے۔ بجنوری غالب کا مقابلہ مشرق و مغرب کے مختلف شاعروں اور ادیبوں سے کرتے ہیں۔ جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ غالب کو بڑھا دینا چاہتے ہیں ان کے خیال میں کوئی مغربی شاعر غالب کا مدمقابل نہیں ہو سکتا۔ سوائے گوئٹے کے کیونکہ گوئٹے کی شاعری میں تفکر ہے۔

بجنوری کی تنقید میں جگہ جگہ تجزیے کی خصوصیت اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ چیزوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں وہ کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری پر انھوں نے جو تنقید کی ہے اس میں شائد ہی کوئی پہلو ان کی نظروں سے بچا ہو۔ محاسن کو زیادہ پیش نظر رکھتے ہوئے دلائل دینے کی خصوصیت ان کی تنقید میں نفسیات کا رنگ بھرتی ہے۔ یہ نفسیاتی انداز تنقید مغرب ہی کے اثرات کا نتیجہ تھا۔ بہر حال ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی حیثیت اردو تنقید اور خصوصاً اس کے اندر مغرب کے اثرات کو لانے میں مسلم ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے تقابلی تنقید کی ابتدا کی۔ ۱؎

عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح مجنوں گورکھپوری کی تنقیدوں میں فکری تصوریت سے زیادہ جذباتیت ملتی ہے۔ مجنوں نے رومانویت کو فلسفے سے زیادہ ایک جذباتی آہنگ کے طور پر اختیار کیا۔ مجنوں کی تنقیدی تخلیقات میں دو اہم رجحانات دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ''تنقیدی حاشیے'' میں نمایاں ہوتا ہے اور دوسرا ''ادب اور زندگی'' میں دونوں تخلیقات کو سامنے رکھ کر موازنہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انھیں دو الگ الگ شخصیتوں نے لکھا ہے۔ ایک میں رومانی افسانہ نگار کی روح بولتی ہے اور اپنے دائمی اضطراب کی جھلکیاں ہر شعر اور ہر شاعر سے لے کر یکجا دکھائی دیتی ہیں۔ دوسرے میں ایک ایسے ذہن کا احساس ہوتا ہے جو ادب کو زندگی کا ایک جزو سمجھتا ہے اور اسی پس منظر میں ادب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ مجنوں کی یہ تنقیدیں رومانوی فکر کا جزو بن چکی ہیں۔

عشق و محبت مجنوں کا فلسفۂ حیات ہے وہ اسے زندگی کی سب سے اہم حقیقت سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک عشق ہی شاعر کے نقطۂ نظر کو بناتا ہے۔۔۔۔اس فلسفے میں رومانی لہجے کی بازگشت پوری طرح سنائی دیتی ہے۔ میر کے بارے میں ان کا یہ تجربہ بڑی حد تک خود ان کے رومانوی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔

"میر سے حزنیہ شاعری میں تخلیقیت اور رومانویت کے دور کی ابتدا ہوئی ہے انھوں نے جب دیکھا کہ تخیلی کامیابی ان کی قسمت میں نہیں تو انھوں نے اپنی محرومی کو تخیلی رنگ دیدیا اس کا نام رومانیت ہے۔"۲۷

عشق کے جذبات کو کائنات کا ماحصل اور زندگی کا فیصلہ کن پہلو سمجھنے کا یہ تصور ان کے سب تنقیدی مضامین میں ملتا ہے۔ رومانی ناقدین تنقید کو ایک داخلی توسیع ذات کا وسیلہ بنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجنوں اور بجنوری دونوں نے اپنی ذات اور اپنے افکار و جذبات کو پھیلا کر اپنے موضوعات پر نافذ کر دیا ہے۔ بجنوری کا موضوع بحث غالب ہیں۔ خود بجنوری میں مجنوں کے موضوع میر، اثر، قائم اور حالی نہیں خود مجنوں کی ذات ہے اور وہ اپنی جذباتیت اپنی گداختگی اور سوز کو ان سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہمیں انفرادیت پرستی اور داخلیت کا وہی عنصر ملتا ہے جو رومانیت کا بنیادی آہنگ قرار دیا جا سکتا ہے۔

عبدالماجد دریا آبادی رومانی نقاد ہیں۔ ان کی تنقید اساسی طور پر مہدی افادی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں جمال پسندی کا عنصر شعریت کے لطیف پیکر میں ظاہر ہوتا ہے اور اپنے تاثر کو جمالیاتی صداقت اور رومانی لطافت سے پیش کرتا ہے۔ عبدالقادر سروری کی تنقیدی تحریریں بھی مغربی اثرات سے مزین ہیں۔ انھوں نے شعر و ادب کی بحث چھیڑتے ہوئے ارسطو، افلاطون اور میتھو آرنلڈ کے خیالات کو پہلو بہ پہلو پیش کیا ہے اور بعض مباحث ایسے بھی چھیڑے ہیں جن کا پتہ اس سے قبل اردو تنقید میں نہیں چلتا۔ مثال کے طور پر سائنس اور شاعری کی بحث یا رزمیہ شاعری کی اقسام پر اظہار خیال کرتے ہوئے سروری نے اپنے خیالات کم پیش کیے ہیں

نہیں ر دوسروں کے خیالات کو زیادہ بیان کیا ہے۔ ان کے تنقیدی نظریات میں کوئی جدت نہیں۔ شاعری سے متعلق خیالات سائنٹفک نہیں رحکیمانہ ہیں لیکن نئے نہیں ہیں کیونکہ انگریزی کے مختلف ناقدین نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن میں سے چند کا ذکر خود پروفیسر سروری نے کر دیا ہے۔ سروری کے تنقیدی خیالات کا اظہار ان کے تنقیدی مضامین 'دنیائے افسانہ' کردار نگاری رافسانہ" اردو مثنوی کا ارتقاء" میں ملتا ہے لیکن "جدید اردو شاعری" کے پہلے حصے میں ان کے یہ تنقیدی نظریات مربوط شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر سروری نے اردو میں سب سے پہلے سائنس اور شاعری کے موضوع پر بحث کی ہے وہ شاعری کا مد مقابل اور تکملہ دونوں سمجھتے ہیں۔ یہ بحث بھی ان کے براہ راست مغربی تنقید سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے بہرحال اگر مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو پروفیسر عبدالقادر سروری کی تنقیدی تحریروں میں مغرب کے اثرات مختلف زاویوں سے پڑے ہوئے نظر آئیں گے لیکن اس میں اخذ و ترجمہ ہی کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔

نیاز فتح پوری نے عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح تنقید میں صرف جذبے کو اساس نہیں بنایا بلکہ اس کے لیے کچھ عقلی اصول بھی وضع کیے ہیں۔ نیاز فتح پوری کی کوئی مستقل تصنیف تنقید پر نہیں ملتی، صرف چند مضامین ہیں جو رسالہ "نگار" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں یہ مضامین اب "انتقادیات" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان سے ان کے تنقیدی خیالات و نظریات اور انداز تنقید کا پتہ چلتا ہے۔ نیاز کے نزدیک مظاہر حسن شاعری کے لیے ضروری ہیں کیونکہ ان مظاہر سے ہر شخص کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "شاعری صرف تاثرات کی زبان ہے۔"[۸] یہ تاثرات مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں نیز لکھتے ہیں:

"شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ یہ مشہور بات ہے لیکن اگر شاعر اسی نظریے پر بھروسہ کر کے شعر کہے تو وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔"[۹]

بالفاظ دیگر نیاز نے باور کرایا ہے کہ صحت زبان اور اظہار بلاغت کے لیے شاعر کا عالم ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ نیاز کی تنقید کے لیے جو مایہ خمیر تیار ہوا ہے اس میں وجدان کے ساتھ ساتھ

عقل اور منطق کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ نیاز فتح پوری کی تنقید جذبے کی صداقت اور شعر کی خشت بندی میں امتیاز پیدا کرنے کی کاوش ہے اور وہ اس کے لیئے رومانی نقاد کی بنیادی آزادی سے دستبردار نہیں ہوتے چنانچہ انھوں نے نہ صرف آزادانہ فیصلے دیئے ہیں بلکہ ان کی صحت پر اصرار بھی کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کے فیصلے میں عجلت یا سیمابیت نہیں بلکہ اس میں ٹھہراؤ اور توازن بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ جملے ملاحظہ ہوں۔

"تغزل میں تصوف کو شامل کر لینا ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے۔" [۳]

"تصوف کے حدود وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔" [۴]

نیاز کے ہاں تنقید میں حسن کی تلاش ایک اساسی خوبی ہے۔ ان کے نزدیک زبان کی صحت اس لیے ضروری ہے کہ یہ شعر کا خارجی پیکر ہے اور اگر خارجی پیکر ہی دلنواز نہ ہو تو حسن کی ایک قدر مجروح ہوتی ہے۔ صحتِ لفظی کے ساتھ ساتھ نیاز خیال کی ندرت اور لطافتِ اظہار کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے تنقید میں وہی تخلیقی اسلوب اختیار کیا جو ان کے افسانوں میں استعمال ہوا ہے۔ نیاز نے لفظیاتی تنقید کے پردے میں جہاں لفظ کے حسن و جمال کو تحفظ فراہم کیا وہاں قاری کو بھی اکتسابِ مسرت کا موقع فراہم کیا۔ مجموعی اعتبار سے اگر ان کی تنقیدی تحریریں دیکھی جائیں تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ شاعری کو کسی بڑے مقصد کے لیے استعمال کرنے کے قائل نہیں 'حسن کاری' حسن آفرینی اور لذت اندوزی ان کے نزدیک شاعری کے لیے کافی ہے اور یہی ان کے نزدیک شاعری کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ [۵]

بہر حال نیاز فتح پوری کے تنقیدی نظریات اور انداز تنقید دونوں اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا رجحان جمالیات کی طرف ہے اور اس کی نوعیت تاثراتی ہے۔ وہ پہلے نقاد ہیں جس نے تاثراتی تنقید کی طرف پوری طرح توجہ کی۔ نیاز کے ساتھ کچھ اور نقاد بھی تنقید کے تاثراتی رجحان کی طرف راغب ہوئے جن میں فراق اور مجنوں کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

رومانی تنقید نے ناقدین کی زیادہ تعداد پیدا نہیں کی تاہم یہ تسلیم کرنا مناسب ہے کہ اس نے

مستقبل کی تنقید کو خاصا متاثر کیا چنانچہ علی گڑھ میں جب سرسید تحریک کا ردعمل ظاہر ہوا تو رومانی انداز تنقید نے زیادہ مقبولیت حاصل کی اور بیسویں صدی کے ربع چہارم میں جب ترقی پسند تحریک نے ادب میں سائنسی اسلوب کو رائج کرنے کی کوشش کی تو رومانیت اور منطق کا امتزاج عمل میں آنا شروع ہو گیا۔ اس دور میں رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور محمد اکرم جیسے نقاد منظر عام پر آئے جنھوں نے تنقید کی زبان کو تخلیقی حسن سے آراستہ کیا اور سنجیدہ موضوعات پر شگفتہ خیالی سے بحث کرنے کی طرح ڈالی، چنانچہ رومانی تحریک کے ختم ہو جانے کے باوجود اس کا جمالیاتی زاویہ معدوم نہیں ہوا بلکہ اسے مستقبل کے بہت سے ناقدین نے قبول کیا اور اس کی روشن کرنوں سے اردو تنقید کو جگمگا دیا۔

اردو کی رومانی تحریک میں مشرق پسندی ایک ایسا آئیڈیل ہے جو اپنی قوت ماضی کی عظمت سے حاصل کرتا ہے۔ رومانی تحریک نے خیال اور اسلوب میں جو ہمہ گیر تغیر پیدا کیا اس کا منفی پہلو یہ تھا کہ ادبا کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے کے عادی ہو گئے اور یوں زندگی کی اصل حقیقت سے ان کا رشتہ نہ صرف کٹ گیا بلکہ وہ خلاؤں میں جھانکنے لگے۔[1]

رومانی تحریک کا یہی پہلو تنقید میں بھی اپنی شد و مد کے ساتھ عیاں ہے۔ رومانی نقاد بھی انداز بیاں کے مزے میں اس قدر کھو گئے کہ انھیں ان حقیقتوں پر پوری توجہ صرف کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، جنھوں نے ان افکار و خیالات کو جنم دیا۔ رومانی تنقید خود فراموشی اور حسن نگارش کی پرستش کا شکار ہو گئی یہاں نقاد کا مقصد تنقیدی سے زیادہ تشریحی تھا۔ اسکا فریضہ یہ نہیں تھا کہ وہ شاعر کی بات کی صداقت یا عدم صداقت کا پتہ لگائے بلکہ اس کا کام یہ تھا کہ وہ شاعر کی فکر کا ماورائی عمل پورے کیف اور جمالیاتی احساس کے ساتھ ایک بار پھر قاری کے لئے سجا دے اور اس کے لیے کیف احساس کے نئے دروازے کھول دے۔ وہ شاعر یا ادیب کا خوش مذاق وکیل پہلے تھا اور نقاد بعد میں۔ وہ مکمل جمالیاتی کیف کو قاری پر پوری طرح منکشف کرنا چاہتا ہے اور اس عمل میں اسقدر مصروف ہو جاتا ہے کہ تخلیقی تنقید کے اصل فریضے کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔[2]

رومانی تحریک میں شدید جذبہ انگڑائیاں لیتا محسوس ہوتا ہے لیکن ایسا جذبہ جسے پختگی سے پہلے ہی اگل دیا گیا ہو، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد جب جذبات کی شدت مدھم پڑ گئی تو تخلیقات کی لطافت بھی زائل ہو گئی اور شعراء میں خیال کی تکرار اور ہیئت کی نقالی کا رجحان پیدا ہو گیا۔ رومانی تحریک کا یہ پہلو خاصا کمزور ہے۔ لیکن اس تحریک کی دوسری فتوحات کو پیش نظر رکھیں تو یہ کمزوری چنداں اہم معلوم نہیں ہوتی چنانچہ آج رومانیت کا فروغ اگرچہ رک گیا ہے اور شعر اس تحریک کی دھند میں کھو گئے ہیں تاہم اس تحریک نے ادب کے ایک پورے دور کو مسحور رکھا اور مستقبل کو تخلیقی جست پر مائل کیا۔ خاص طور پر رومانی تحریک کے زیر اثر وجود میں آنے والی تنقیدی کاوشیں ایک اہم سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس تحریک کی یہ عطا نظر انداز نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنہرے باب کی حیثیت سے رقم کی جا سکتی ہے۔

کتابیات

۱ محمد صدیق شبلی، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکات اور تنقیدی نظریات، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۱۹۸۷ء

۲ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۳ء

۳ محمد ہادی حسن، مغربی شعریات، لاہور، مجلس ترقی ادب (طبع اول) ۱۹۶۸ء

۴ محمد حسن، ڈاکٹر، اردو ادب کی رومانی تحریک، ملتان، کاروان ادب، ۱۹۸۶ء

۵ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۸۰-۱۹۷۹ء

۶ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۷۵ء

۷ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو کی مختصر ترین تاریخ، لاہور سنگ میل، ۱۹۷۳ء

۸ عبداللہ، ڈاکٹر سید، اشارات تنقید، لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۴۴ء

۹ محمد یاسین، ڈاکٹر، انگریزی ادب کی مختصر تاریخ، لاہور بک چینل، ۱۹۹۳ء

۱۰ مہدی الافادی، افادات مہدی، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۳۹ء

۱۱ عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر، محاسن کلام غالب، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ۱۹۵۲ء

۱۲ عبدالقادر سروری، جدید اردو شاعری، لاہور، کتاب منزل، ۱۹۳۶ء

۱۳ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب، جلد پنجم، راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج ۱۹۸۲ء

مقالات

۱ وزیر آغا، ڈاکٹر، بیسویں صدی کی ادبی تحریکیں، نئے تناظر، لاہور، ۱۹۸۱ء

۲ ایم۔ایم۔شریف، جمالیات اقبال کی تشکیل ترجمہ سجاد رضوی فلسفہ اقبال، کراچی، نوائے وقت ۱۹۷۳ء

۳ خورشید الاسلام، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، فنون شمارہ ۱۲

English books:

1. Will Durant ' The story of philosphy ' New York 1962

2. F.L. Lucas' the Decline and Fall of Romantic,ideal, cambridge, 1954

سیّدہ نغمہ زیدی

''خضرِ راہ'' افکارِ اقبال کا دلکش نمونہ

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا پہلا اردو مجموعۂ کلام ۱۹۲۴ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ اقبال نے اس مجموعے کا نام ''بانگِ درا'' قرار دیا۔ قافلے میں درا یا جرس کا وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ کوچ سے پیشتر قافلے کے سوئے ہوئے حصوں کو جگا دے تا کہ وہ رختِ سفر باندھ کر چلنے کے لیے مستعد ہو جائیں پھر پورا قافلہ بانگِ درا کی رہنمائی میں متحد ہو کر منزل طے کرے۔ اقبال کا یہ مجموعہ قوم کے لیے پیغامِ بیداری تہیہ سفر اور متحدہ حیثیت میں منزلِ مقصود کی جانب سفر کا وسیلہ تھا۔ اس مجموعۂ کلام میں اقبال کے کمالِ فکر کی گوناگوں قلم کاریاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مناظرِ قدرت پر نظمیں، قومی و فلسفیانہ نظمیں، غزلیں، بچوں کے لیے نظمیں، تاریخی نظمیں وغیرہ۔

کتاب کے حصہ سوم میں نظم ''خضرِ راہ'' اُن کے حُسنِ خیال اور دل آویزیِ بیان کا ایسا رنگا رنگ مُرقع ہے۔ جس کی نظیر نہیں ملتی۔

یہ نظم اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے ۳۷ ویں سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی جو اپریل ۱۹۲۲ء کو اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں منعقد ہوا تھا۔ یہ نظم سننے کے لیے ہزاروں افراد جمع تھے۔ بعض اشعار پر اقبال خود بھی بے اختیار روئے اور مجمع بھی اشک بار ہو گیا۔

عالمِ اسلام کے لیے وہ وقت بہت نازک تھا۔ قسطنطنیہ پر اتحادی قابض تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ اتحادیوں کے ایما پر یونانیوں نے اناطولیہ میں فوجیں اُتار دی تھیں شریف حسین جنگ کے زمانے میں انگریزوں کے ساتھ مل کر سلطنتِ عثمانیہ سے بغاوت کر چکا تھا۔ اس وجہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو عرب کے مختلف حصوں میں براہِ راست مداخلت کا موقع مل گیا۔ اس طرح مسلمانوں پر رنج و غم کی گھٹائیں چھا گئیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ہجرت کی تحریک جاری ہوئی پھر خلافت اور ترکِ موالات کا دور شروع ہوا۔ ہزاروں مسلمان قید ہوئے اور

دنیائے اسلام کے روبرو مت نئے مسائل آ گئے۔ اس تاریخی تناظر میں اقبال نے اپنی نظم" خضرراہ" لکھی۔ اور اہم مسائل کے متعلق حضرت خضر علیہ السلام کی زبان سے مسلمانوں کے سامنے صحیح روشنی پیش کی۔ اس نظم کا نام" خضرراہ" اس وجہ سے رکھا کہ یہ مشکلات و مصائب کے نازک دور میں رہنمائی کا پیتا رہی۔

ابتدا میں نظم میں صرف دو عنوان تھے۔ پہلے دو بندوں کا عنوان تھا" شاعر" یعنی شاعر کا خطاب حضرت خضرؑ سے باقی نو بندوں کا عنوان تھا" جواب خضر" نظر ثانی میں اقبال نے مختلف مسائل پر الگ الگ عنوانات قائم کر دیے۔ اقبال کی نظم" خضرراہ" بعض وجوہ سے یگانہ حیثیت کی حامل ہے۔ کیونکہ یہ ایک منفرد انداز رکھتی ہے۔ اگر چہ اس میں اسلوب قدیم کے تمام محاسن موجود ہیں مگر اظہار خیال کا طریقہ ایسا ہے جسے مغربی ادب سے گہرا قرب حاصل ہے۔ اس نظم میں نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ تمام عالم انسانیت کے اہم ترین مسائل کا ذکر نہایت گہرائی سے کیا گیا ہے۔ عوام وخواص اپنے اپنے فہم و ادراک کے مطابق اقبال کے افکار سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ انداز بیان میں رعنائی، روانی، نیرنگی اور دردمندی ہے مغربی زبانوں میں اس کا ترجمہ کرنا سہل ہے۔ اقبال نے فلسفیانہ افکار کو اس آسانی سے بیان کیا ہے کہ یہ نظم عام فہم بن گئی ہے۔ نظم میں اقبال نے حضرت خضر علیہ السلام سے رہنمائی طلب کی ہے۔ جن کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ کہف میں ہوا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے خاص بندوں میں سے ایک بندے سے ملے۔ جسے براہ راست علم عطا کیا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کے ساتھ رہ کر یہ علم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ صبر نہ کر سکیں گے۔ بہر حال حضرت موسیٰؑ اور خدا کا وہ بندہ سفر کے لیے نکلے۔ اس سفر میں تین واقعات پیش آئے۔ دونوں سمندر کے کنارے پہنچے اور کشتی میں سوار ہوئے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بول اٹھے۔ کیا آپ نے کشتی میں سوراخ اس لیے کر دیا ہے کہ تمام مسافر ڈوب جائیں۔" کشتی مسکین" سے اشارہ اس واقع کی طرف ہے۔ دونوں آگے چلے تو ایک

لڑکا ملا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اُسے قتل کر ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی۔ ”جان پاک“ سے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ آگے بڑھے تو ایک گاؤں کے لوگوں سے کہا کہ کھانے کا انتظام کرو۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ اس گاؤں میں ایک پرانی دیوار گرا چاہتی تھی۔ آپ نے اُس کی مرمت کر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بول اٹھے۔ کہ آپ چاہتے تو اس محنت کا کچھ معاوضہ طلب کر لیتے۔ ”دیوار یتیم“ سے اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے۔

رخصت ہوتے وقت حضرت خضر علیہ السلام نے تینوں کاموں کے معقول سبب بیان کر دیے۔ مثلاً کشتی میں دراڑ اس وجہ سے ڈالی کہ ایک ظالم بادشاہ کشتیاں بیگار میں پکڑ رہا تھا۔ اُس کشتی کو بھی لے لیتا تو چند مسکینوں کی روزی کا ذریعہ ختم ہو جاتا۔ لڑکے کو اس لیے قتل کیا کہ وہ اپنی سرکشی اور کفر سے نیک والدین کو دُکھ پہنچائے گا۔ اُمید ہے خدا انھیں بہتر اولاد دے۔ دیوار اس لیے درست کی کہ وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی اور اس کے نیچے خزانہ گڑا تھا۔ دیوار ڈھے جاتی تو لوگ خزانہ نکال کر لے جاتے۔

قرآن میں ان واقعات کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ ہم ظاہراً جو کچھ دیکھتے ہیں ضروری نہیں حقیقت میں بھی وہی ہو۔ نظم خضر راہ کے پہلے بند میں شاعر نے خطاب کیا ہے۔ اور رات کے دلکش منظر کی عکاسی کی ہے۔ کہ میں ایک رات ساحل دریا پر محو نظارہ تھا۔ ہوا ساکن تھی، رات خاموش اور دریا کا پانی نرم روی سے رواں دواں تھا دریائی مضطر موجیں طفل شیر خوار کی مانند گویا گہوارے میں سو رہی تھیں پرندے آشیانوں میں اسیر اور ستارے طلسم مہتاب میں گرفتار تمام کائنات پر ایک سحر طاری تھا۔ ان اشعار میں شاعر نے رات کے خواب ناک منظر کی نہایت حسین عکاسی کی ہے۔ گویا ماحول اپنی حقیقی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ اور ہر شعر فکر و نظر کی ایک بولتی تصویر نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر — تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار — موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب

رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر   انجم کم ضو گرفتارِ طلسم ماہتاب

ایسے عالم میں کیا دیکھتا ہوں کہ دُنیا کی پہنائیوں میں چکر لگانے والے حضرت خضرؑ نمودار ہو گئے ہیں۔ ان کے بڑھاپے میں بھی جوانی کی رعنائی و دلکشی نمایاں تھی۔ اور وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اے ازلی بھیدوں کی تلاش میں بے قرار پھرنے والے! کیا تجھے معلوم نہیں کہ دل کی آنکھ کھلی ہو تو اس دنیا کی تقدیر سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور عالم بے حجاب نظر آنے لگتا ہے۔

اقبال نے حضرت خضر علیہ السلام کو بوڑھا بتایا ہے۔ کیونکہ آپ زندہ ہیں اور آپ کی عمر انتہائی طویل ہے۔ لیکن باوجود طویل العمری کے آپ جوانوں کی طرح چست و چالاک اور مستعد نظر آتے تھے۔ حضرت خضر کا ارشاد سُنتے ہی شاعر کے دل میں شور بپا ہو گیا اور وہ آپ کی زبانی کائنات کے اسرار و رموز جاننے کے لیے بے چین و مضطرب ہو گیا اور تجسس کے عالم میں ان سے ہمکلام ہوا۔

حضور والا! آپ کی نگاہیں دُنیا کی حقیقتوں سے واقف ہیں۔ آپ اُن طوفانوں سے بھی آگاہ ہیں۔ جن کا شور ابھی دریا کی تہ میں چپ چاپ سو رہا ہے۔ آپ مستقبل کے علم سے آگاہ ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر آپ کے علم کے سامنے پیکرِ حیرت بن گئے۔ کشتی مسکین، جانِ پاک اور دیوارِ یتیم کے واقعات قرآن پاک میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان واقعات کی تہ میں چھپا ہوا علم صرف آپ کو ہی تھا۔ جو خدا نے آپ کو اپنی خاص رحمت سے عطا کیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس علم سے بے خبر تھے۔ آپ آبادی کو چھوڑ کر صحراؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ عام انسانوں کی زندگی کے برخلاف نہ اس میں دن ہے نہ رات، نہ آئندہ کل ہے۔ نہ گذشتہ کل۔ براہ مہربانی فرمایئے کہ زندگی کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے۔ اور سرمایہ داروں اور محنت کشوں میں یہ کیا جھگڑا ہے۔ ایشیا کی سرزمین جو صدیوں سے عظمت کی مالک تھی۔ اس کا لباس عظمت کیوں تار تار ہو رہا ہے۔ جو قومیں کل تک گم نام تھیں آج قوت و طاقت حاصل کر کے دُنیا پر چھا رہی ہیں۔ ان کی کامیابی کا کیا راز ہے۔؟ ان کے نوجوان نئے نئے لباسوں میں آراستہ نظر

آتے ہیں۔ سکندر اعظم آب حیات نہ پی سکا مگر بادشاہی فطرت اب تک پینے پلانے میں مصروف ہے۔ وہ شراب نوشی کے مزے لوٹ رہی ہے۔ ہاشمی ناموس مصطفیٰ بیچ رہے ہیں۔ ترکمانوں کا خون خاک میں مل رہا ہے۔ آگ کا الاؤ روشن ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کا امتحان ہے۔ نمرود مسلمانوں کا آج پھر امتحان لے رہا ہے۔ اس تمام بند میں اقبال نے نہایت دردمندی سے مختلف سوالات اٹھائے ہیں۔ اور حضرت خضر سے رہنمائی حاصل کی ہے۔

نمرود سے اشارہ اُن ظالم و جابر قوتوں کی طرف ہے۔ جو مسلمانوں کو مٹانے پر تلی ہوئی ہیں۔ جس طرح نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں پورے اترے اور اللہ کے حکم سے یہ آگ گلزار بن گئی۔ اقبال کے نزدیک عالم اسلام کی پھر ویسی ہی حالت ہو گئی ہے۔ اسی لیے پوچھتے ہیں۔ کہ مسلمان قوم کیوں زوال کا شکار ہے؟ حکومت و سلطنت کے اسرار و رموز میں مسلمان کیوں اپنے دین و ملت سے برگشتہ ہو کر دین اسلام کی عزت بیچ رہا ہے۔ یہاں اقبال کا اشارہ شریف حسین کی طرف ہے۔ جو انگریزوں کے ساتھ مل کر سلطنت کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ اور ترک خاک و خون میں مل رہے تھے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟ | اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک | نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی | فطرت اسکندری اب تک ہے گرم نا و نوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ | خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش
آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے | کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

یعنی مسلمانوں پر جو سخت وقت آیا ہوا ہے۔ کہ وہ تمام عالم میں رو بہ زوال ہیں۔ کیا یہ ان کا امتحان ہے؟ ایسا ہی امتحان جیسے حضرت ابراہیمؑ کا اللہ تعالیٰ نے لیا تھا۔ اقبال مسلمانان عالم کی کیفیت کو امتحان سے تعبیر کرتے ہیں۔ شاعر کے ان اضطراب آمیز سوالات کا جواب حضرت خضر علیہ السلام نہایت تفصیل سے دیتے ہیں۔ اور ایک ایک جزو کی پوری وضاحت کرتے ہیں خضر

پیدا ہوتی ہیں۔ انسان اور فطرت کا گہرا رشتہ بنتا ہے۔ محبت کا سودا رکھنے والے ویرانوں کو تلاش کرتے ہیں اور شہروں اور آبادیوں کے رہنے والے کھیتوں اور باغوں کی ہریالی میں محنتی نہیں بن سکتے۔ وہ سختیاں اور مشکلات جھیلنے کے عادی نہیں بن سکتے۔ کھیتوں اور باغوں سے لطف اندوز ہونے والے نازک مزاج زندگی کا راز کیا جانیں۔ زندگی کا پیالہ لگا تار گردش سے ہی پختہ تر ہوتا ہے۔ اے بے خبر! زندگی کے ہمیشہ باقی رہنے کا یہی راز ہے۔ زندگی مسلسل جدوجہد لگا تار عمل اور محنت کا نام ہے۔ اپنے ان خیالات کو بہ زبان خضر یوں بیان کرتے ہیں۔

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے؟	یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام	وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ سکوتِ شام صحرا میں غروبِ آفتاب	جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں	اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش	اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی	ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

خضر زندگی کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اور فلسفۂ زندگی کو دلکش تشبیہ و استعارات کے ذریعے ذہن نشین کرواتے ہیں۔ اس بند میں اقبال نے زندگی کی ماہیت، اہمیت اور مقاصد زندگی کی نہایت حسین توجیہات پیش کی ہیں۔ اقبال نے زندگی کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ اُن کے نزدیک زندگی نفع ونقصان سے بالاتر ہے۔ کبھی کبھی جان قربان کرنے کے بعد نئی زندگی ملتی ہے کبھی وہ جاں ہو جاتی ہے، اور کبھی تسلیم جاں۔ زندگی کو شب و روز کے گزرنے سے نہیں ناپا جاتا ہے۔ کبھی کبھار کم مدت حیات میں بھی لوگ وہ کارنامے انجام دے جاتے ہیں۔ جو انھیں ابدی زندگی بخش دیتے ہیں۔ زندگی مسلسل رواں دواں اور جواں رہتی ہے۔ موت زندگی کا اختتام نہیں۔ بلکہ ایک نئی زندگی کی شروعات ہے۔ زندہ لوگ اپنی دنیا خود پیدا کرتے ہیں۔ زندگی آدم کا راز ہے۔ کائنات کا ضمیر ہے یعنی آدم کی پیدائش اور کائنات کا ظہور زندگی ہی کے کرشمے ہیں۔ زندگی

سخت کوشی کا نام ہے۔ زندگی کی حقیقت کا راز فرہاد ہی جانتا تھا۔ زندگی تیشے بھاری پتھر اور پہاڑ کو کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے کا نام ہے۔ یعنی سخت محنت و ریاضت سے ہی زندگی میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ عظیم لوگوں نے مشکلات و تکالیف برداشت کر کے ہی زندگی میں نام پیدا کیا ہے۔ زندگی آزادی کا نام ہے۔ زندگی محکومی و غلامی کی حالت میں ایسی ندی کی مانند ہو جاتی ہے جس میں پانی کم رہ گیا ہو۔ انسان دنیا میں امتحان دینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ انسان کا مقصد حیات زندگی کے بھید کو جاننا اور اشیائے کائنات کو تسخیر کرنا ہے۔ انسان مٹی کا ایک پتلا ہے۔ اس کی حیثیت زندگی کے سمندر میں ایک بلبلے سے زیادہ نہیں۔ لیکن وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لیکر ایسی دو دھاری تلوار بن سکتا ہے۔ جس کی کاٹ بے مثال ہو۔ اقبال تلقین کرتے ہیں کہ اگر اپنی صلاحیتوں سے کام نہ لیا تو انسان کی حیثیت ایک مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہ ہوگی۔ اپنے بے مثال خیالات کو اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی | ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ | جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ | جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے | گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب | اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو | پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

خضر تلقین کرتے ہیں۔ جس دل میں مرنے کی تڑپ ہو اُسے چاہیے کہ اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے۔ اپنا جہاں آپ پیدا کرے۔ محنت و عمل سے زندگی کی قوت پنہاں کو آشکار کرے۔ یعنی انسان اپنی خودی کو مستحکم کر کے عمل کے ذریعے اس جہان آب و گل کو تسخیر کرے۔ صداقت کے لیے قربانی دے اور مسلمان عہدے، مال و دولت، عزت و حکومت کا لالچ چھوڑ دے اور پاک نیت سے ملک و قوم کی خدمت کرے تو وہ آفتاب کی طرح افق مشرق پر چمک اٹھے گا۔

زندگی کی قوت ایسی چنگاری ہے جس میں ہمیشہ رہنے والی روشنی ہے۔ ایشیٰ کی اقوام اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر آسمانوں پر بے سفیر بھیج سکتیں ہیں۔ اگر عزم وارادہ پختہ ہو تو محنت وعلم کے ذریعے بدخشاں کی سرزمین پھر وہی نایاب لعل پیدا کرسکتی ہے۔ جیسے ماضی میں تھے۔ اقبال مسلمان قوم کی توجہ عمل اور جدوجہد کی طرف دلاتے ہیں اور خضر کی زباں سے اُن کے زوال کا علاج تجویز کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مشرق کی زندگی جن حالات سے دوچار ہے۔ وہ تو عرصہ محشر کا منظر پیش کر رہی ہے۔ اسکے لیے عمل کی شدید ضرورت ہے۔ اے غافل! اللہ تعالی کی بارگاہ میں نالہ وفریاد کر اور قوت عمل سے اپنی قوم کی زندگی کو مالا مال کردے۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ	پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار	اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب	تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے	پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

چھٹے بند میں خضر علیہ السلام سلطنت وبادشاہت کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں میں تجھے بتاؤں کہ آیۂ ان الملوک کا رمز کیا ہے۔ جسے تو حکومت اور سلطنت سمجھتا ہے وہ درحقیقت سرمایہ داری اور ہوس ملک گیری کے تماشے ہیں ایک ملک دوسرے کو غلام بنا لیتا ہے۔ قوموں کی حکمرانی محض جادوگری ہے حکمران ملوکیت کے سحر سے عوام کو اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں۔ وہ غلامی کے طوق کو سازِ دلبری سمجھ لیتے ہیں۔ حکمران رعاتیں دے کر اور بڑے عہدوں کا لالچ دے کر محکوم عوام کی نفسیات بدل دیتے ہیں محمود کی آنکھ کے جادو سے ایاز غلامی کے حلقے کو محبوبیت اور آرائش کا سامان سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی محکوموں کا خون جوش میں آجاتا ہے اور کوئی موسیٰ جیسا رہنما اٹھ کر حاکم کے سامری طلسم کو توڑ ڈالتا ہے۔ مغرب نے مشرق پر غالب آکر یہی صورت حال پیدا کردی ہے مغرب کا جمہوری نظام درحقیقت جبر واستبداد کی ہی ایک شکل ہے۔ یہ بھی بادشاہت وملوکیت کی ایک قسم ہے۔ گویا ظلم وستم کا دیو جمہوری لباس میں ناچ رہا ہے۔ اور مشرق کے لوگ اُسے آزادی کی

نیلم پری سمجھ رہے ہیں۔

اقبال یہاں مغربی جمہوریت کے نقائص بیان کرتے ہیں۔ مغربی جمہوریت سرمایہ داری کی ایک شکل ہے۔ جنگ زرگری ہے یہ مجلس قانون ساز اصلاح و رعایات کے نام پر عوام کے حقوق سلب کر لیتی ہے۔ یورپ والوں نے محکوم ملکوں میں جو نمائندہ ادارے قائم کیے تھے وہ حقیقت میں آزادی کی دستاویز نہ تھے۔ ان اشعار میں اقبال نے خاص طور پر ان اصلاحات کی طرف اشارہ کیا ہے جو ۱۹۲۱ء میں انگریزوں نے برصغیر میں دی تھیں انھیں مانٹگو چیمسفورڈ اصلاحات یا دوعملی کا نظام کہتے تھے۔ ملک کے بڑے حصے نے اصلاحات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ کیونکہ ان سے مسلمانوں کو خاص فائدہ نہ پہنچا۔ اقبال کہتے ہیں مغربی جمہوریت سراب ہے۔ یہ آشیانہ نہیں قفس ہے۔ مغربی جمہوریت کو سب کچھ سمجھ لینا ایک بڑی غلطی ہوگی۔ یورپی طب کی یہ دوائیاں ذائقے میں بہت میٹھی ہیں مگر ان کے اثر سے کھانے والوں پر غفلت کی نیند طاری ہو جاتی ہے۔ مجالس قانون ساز میں ممبر بڑھ چڑھ کر تقریریں کرتے ہیں۔ دراصل یہ عوام کو فریب دینے کے نئے نئے طریقے ہیں۔ نظام جمہوریت سے انسانیت کا مداوا نہیں ہوتا بلکہ مسائل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو جاتے ہیں یہ اشعار موجودہ دور کی اجتماعی زندگی کے صحیح ترجمان اور سیاسی شعور کے صحیح عکاس ہیں۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو — آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

سرمایہ و محنت کے عنوان کے تحت اقبال بہ زبان خضر مزدوروں کے مسائل اور ان کا حل بیان کرتے ہیں۔ خضر فرماتے ہیں۔ کہ بندۂ مزدور کو میرا پیغام دے دو۔ یہ وہ آواز ہے جو کائنات کا پیغام ہے۔ اے مزدورو! سرمایہ دار مختلف حیلہ بہانوں سے تمہارے حقوق غصب کر رہے ہیں۔

مزدور اپنے خون پسینے سے تہذیب کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ مگر سرمایہ دار اس کو اپنی ملکیت قرار دیتا ہے۔ اُس کی مزدوری نہایت قلیل ہوتی ہے سرمایہ دار یوں مزدوری دیتے ہیں جیسے اہلِ ثروت غریبوں کو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ سرمایہ دار مزدوری بھی بخشش سمجھ کر دیتے ہیں سرمایہ دار کی چالوں کو مزدور سمجھ نہیں سکتے کیونکہ وہ سادہ لوح ہیں۔ گویا سرمایہ داروں نے مزدوروں کو نشہ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ نسل و قومیت کے امتیازات، ذات، پات کی تقسیم، مذہبی نظام کلیسا اور کالے گورے کی تفریق پیدا کر کے عوام کو دھوکہ دے رکھا ہے۔ انہی ہتھکنڈوں سے یورپ میں پادری اور برصغیر میں برہموں نے اپنی بادشاہت قائم کر رکھی ہے۔ غریب مزدور ان کے جال میں پھنس کر زندگی کی بازی ہار بیٹھا ہے۔ ان خیالی دیوتاؤں کے لیے اس نے اپنی جان قربان کر دی ہے۔ سرمایہ دار مکر و فریب سے کام لے کر مزدور کے حق پر ڈاکہ ڈالتے رہے ہیں۔ اور مزدور اپنی فطری سادگی سے شکست کھا گیا ہے خضر بتاتے ہیں کہ صدیوں سے غریب مزدور، کاشتکار اور غریب عوام پر امراء حکومت کر رہے ہیں۔ تہذیب و تمدن، رنگ و نسل کے مسکرات چُن چُن کر بنائے گئے ہیں۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ مزدور اپنے حق کو حاصل کریں۔ خضر پیغام دیتے ہیں:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ "خواجگی" نے خوب چُن چُن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ماضی کی سرگزشت یہی ہے کہ مگر اے مزدور! اب تجھے بیدار ہو جانا چاہیے۔ ہمت مردانہ کے سامنے دریا بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے تو کب تک شبنم کے چند قطروں کی طرح مزدوری قبول

کرتا رہے گا۔ دنیا بھر میں جمہوری بیداری کے ترانے گائے جا رہے ہیں۔ نیا نظام آ گیا ہے۔ سکندر اور جمشید جیسے بادشاہوں کے قصے کب تک سُنتا رہے گا۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ زمانے کے بطن سے نیا نور طلوع ہو رہا ہے۔ آسمان کو ڈوبے ہوئے ستاروں کا ماتم کرنے کی بجائے نیا افق تلاش کرنا چاہیے۔ آج کا انسان آزادی طلب ہے۔ اُس نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں۔ جنت سے دور ہو کر انسان کب تک آنسو بہاتا۔ بہتر ہے وہ اپنی جنت آپ پیدا کرلے۔

خضر مزدور کو آمادہ کرتے ہیں کہ وہ عزم و ہمت سے کام لے کر سرمایہ داری کے اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ اقبال کا اشارہ روس چین اور اشتراکی ممالک کی مزدور تنظیموں کی طرف ہے مزدور اب اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے ہیں۔ اب کاروبارِ عالم کی باگ ڈور جمہور کے ہاتھ میں ہو گی۔ پھول اپنے زخم کے علاج کے لیے باغباں کے پاس نہ جائے گا۔ بلکہ بہار سب زخموں کا علاج کرے گی۔ اے ناداں مزدور! تو سرمایہ داری کی شمع کے گرد چکر لگانا چھوڑ دے اپنی فطری صلاحیتوں کو کام میں لا کر ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہو۔

آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک
باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو
کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو

آخری بند میں شاعر نے دُنیائے اسلام کو موضوع بنایا ہے۔ خضر فرماتے ہیں تو مجھے ترکوں اور عربوں کی داستان کیا سُناتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے حالات مجھے معلوم نہیں کہ آج کل عالمِ اسلام کا کیا حال ہے۔ عیسائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ورثہ مسلمانوں سے چھین کر لے گئے ہیں۔ یعنی وہ علوم جو مسلمانوں نے پھیلائے تھے۔ عیسائی وہ تمام کتب کا خزانہ لوٹ کر لے گئے۔ اور حجاز کی خاکِ پاک سے کلیسائی بنیاد کے لیے اینٹیں بننے لگیں ہیں مُسلمانوں نے مشرق و مغرب میں

جو عظیم الشان سلطنتیں قائم کی تھیں اُن پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ مثلاً اُندلس، مراکش، طرابلس، مصر، شام فلسطین وغیرہ۔ حجاز بھی اجنبی اثرات سے محفوظ نہ رہا۔ مسلمان جو سرخ ترکی ٹوپی پہننے کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ آج مجبور و بے کس نظر آ رہے ہیں۔ مسلمان ممالک رو بہ زوال ہیں۔ ایرانی بھی یورپ کی تہذیب و تمدن کو اپنا رہے ہیں۔ گویا یورپی شراب کے نشہ میں چور ہو چکے ہیں۔ برطانیہ اور روس نے ایران کو تقسیم کر کے یورپی تمدن کو عام کر دیا ہے۔ یورپ کی عیارانہ چالوں سے ملت اسلامیہ کا ایسا حال ہو گیا ہے۔ جیسے قینچی سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے۔ یورپی اقوام مسلمانوں کا خون بہا رہی ہیں۔ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد نہیں رہا۔ یورپ نے ملتِ اسلامیہ کے حصے بخرے کر ڈالے ہیں وہ نظریۂ وطنیت کے تحت متعدد فرقوں اور حکومتوں میں بٹ کر کمزور ہو چکے ہیں۔ کیا تم نے مولانا رومؒ کا وہ قول نہیں سُنا کہ جس پرانے مقام کو نئے سرے سے آباد کرنا چاہتے ہیں سب سے پہلے اس کی بنیاد اکھاڑتے ہیں۔ خضر بہ زبان حال مسلمانوں کی حالت زار کا بیاں کرتے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیلؑ	خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کُلاہِ لالہ رنگ	جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز
حکمتِ مغرب سے مِلت کی یہ کیفیت ہوئی	ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو	مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند	می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

خضر مسلمانوں کے حال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انہیں بہتر مستقبل کے لیے مشورے اور تجاویز دیتے ہیں۔ اگر چہ عروج و زوال فطری ہیں۔ دنیا میں قوموں پر عروج و زوال آتا رہتا ہے۔ مگر قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ مسلمان قوم نے زوال کو اپنا مقدر سمجھ لیا ہے۔ مایوسی اور بددلی نے انہیں بے عمل اور سست بنا دیا ہے۔ وہ اپنی غلطیوں کوتاہیوں اور برے حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھ رہے۔ خضر احساس دلاتے ہیں۔ کہ برصغیر پاک و ہند اور تمام دُنیا میں مُسلمانوں کی

سلطنتیں چھن جانے کے بعد ملت اسلامیہ کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں سیاست فرنگ نے انھیں اپنا شکار بنالیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں چشم بصیرت عطا کی ہے۔ انھیں عقل سے کام لے کر موجودہ حالات کو بدلنا ہوگا بھیک مانگ کر مومیائی حاصل کرنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے جوڑوں کا شکستہ رہنا گوارا کرے۔ اگرچہ تو ایک حقیر چیونٹی ہے۔ لیکن خودداری کا تقاضہ ہے کہ کسی سلیمان کے روبرو اپنی حاجت نہ لے جا۔ اقبال قوم کو غیرت وخودداری کا درس دے رہے ہیں۔ اقوام مشرق کی نجات آپس کے میل جول میں ہے۔ ایشیا والوں کو اتفاق واتحاد کا دامن تھام لینا چاہیے۔ مگر وہ ابھی تک اس نکتے سے بے خبر ہیں۔ اے مسلمان! تو سیاست چھوڑ کر دین کے قلعے میں داخل ہوجا مسلمان کا نصب العین دین کے احکامات پر مکمل عمل ہونا چاہیے۔ اسی طرح ملک وملت کے مسائل حل ہوں گے۔ ماضی میں مسلمانوں کو عروج صرف اس لیے حاصل ہوا کیونکہ وہ اپنے دین کے اصولوں پر قائم تھے۔ سلطنت و دولت صرف کعبے کی حفاظت کا ثمرہ تھی کعبہ کی حفاظت کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک تمام مسلمانوں کو متحد ہوجانا چاہیے۔ نااتفاقی اور لڑائی جھگڑا اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا سبب ہے۔ اسلام نے رنگ، نسل، علاقے اور قومیت کے تمام امتیازات مٹا دیے ہیں۔ جو ان تفرقات میں الجھا رہے گا۔ خواہ وہ شاہی خیموں میں رہنے والا ترک ہو یا اونچے گھرانے کا عرب۔ وہ نقصان اٹھائے گا۔ اگر مسلمان نے نسل کو مذہب پر ترجیح دی تو وہ راستے کے غبار کی طرح اس دُنیا سے ہوا ہو جائے گا۔ اتحاد اسلامی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امتیاز رنگ وخوں کو چھوڑ کر وحدت ملت اختیار کرنا ہوگی۔ اسی لیے خضر علیہ السلام خلافت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے اسلاف کے قلب وجگر کو ڈھونڈ کر لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اے مسلمان! اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل اُن جیسی صفات اور اخلاق حمیدہ اپنا۔ ویسی ہی محنت وریاضت اختیار کر۔ علم وعمل سے پختہ کردار بن۔ مگر تیری حالت کیا ہے۔؟ تو فرقہ پرستی میں مبتلا ہے۔ تو پوشیدہ اور ظاہر، خفی اور جلی، اصولی اور جزوی باتوں میں فرق نہیں کرسکتا۔ چشم بصیرت اور ہوش وحواس سے کام لے۔ یہ فرقہ پرستی اسلام کے لیے زہر قاتل ہے۔ خضرؑ امتِ مسلمہ کے

امراض کا علاج مندرجہ ذیل اشعار میں بتاتے ہیں۔

ربط و ضبط ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات	ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو	ملک و ملت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے	نیل کے ساحل سے لیکر تا بہ خاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا	ترک خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

آخری بند میں خضرؔ مسلمان قوم کو اچھے مستقبل کی خوشخبری دیتے ہیں ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ جذبے سے کام لے کر علم و عمل کے ذریعے بُرے حالات کی اس دلدل سے نکلنا ہوگا۔ روشنی کی کرنیں تاریکیوں میں پھوٹتی ہیں۔ سچے دل سے جو فریاد کی جائے۔ اس کا اثر ضرور ہوتا ہے میں چشمِ بصیرت سے دیکھ رہا ہوں کہ ایک نیا جہاں پیدا ہو رہا ہے۔ اسلام نے عوام کی آزادی کا جو خواب چودہ سو سال پہلے دیکھا تھا آج اس خواب کی تعبیر نظر آرہی ہے۔ بیداری کا پیغام برگ و باد لا رہا ہے۔ مغربی دُنیا کا عروج زوال میں بدل جائے گا۔ اقبال کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور اُن کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد دوسری جنگ یورپ شروع ہوئی جس نے یورپ کے قویٰ کو مضمحل کر دیا۔ وہ مسلمانوں کو اُمید دلاتے ہیں کہ سمندر کو دیکھو وہ جل کر راکھ بنتا ہے لیکن وہی راکھ اس کے لیے نئی زندگی کا سامان بن جاتی ہے۔ تو آنکھیں کھول اور میرے کلام کے آئینے میں آنے والے زمانے کی دھندلی سی تصویر دیکھ لے۔ اس نظم میں شاعر نے فکر کی گہرائی اور شعور کی پختگی سے کام لیا ہے۔ اور قوم کو روشن مستقبل کی نوید دی ہے۔ جذب و شوق کی فراوانی اور درد و دل کی آمیزش سے یہ نظم شاعرانہ کمالِ فن کا لازوال نمونہ بن گئی ہے یہ نظم بصیرت و حرکت اور فکر و عمل کا حسین شاہکار ہے۔ ان افکار و خیالات پر عمل پیرا ہو کر مسلمان قوم بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ مگر افسوس ہم کلامِ اقبال پر عمل پیرا نہیں رہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کلامِ اقبال کی روح کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کریں اور عمل کی شاہراہ پر گامزن ہو کر انھیں سچے دل سے خراجِ عقیدت پیش کریں۔ مندرجہ ذیل اشعار فکرِ اقبال کا نچوڑ ہیں۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی ۔۔۔ اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے ۔۔۔ اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں ۔۔۔ آنے والے وقت کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس ۔۔۔ سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ۔۔۔ ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

غیر مطبوعہ / ترجیحاً تازہ نگارشات

(قلمی معاونین کی خدمت میں گذارش)

ہم اپنے معزز قلمی معاونین سے ملتمس ہیں کہ وہ ''الاقرباء'' کو صرف ایسی نگارشات نظم ونثر مرحمت فرمائیں جو غیر مطبوعہ اور ترجیحاً تازہ تخلیقات ہوں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم بعض ایسی نگارشات کو شائع نہیں کر سکتے ہیں جن کی قبل ازیں اشاعت ہمارے علم میں آ گئی ہیں۔ بہر حال ہم شکر گزار ہوں گے اگر ''الاقرباء'' کے لیے ترسیلات پر ''غیر مطبوعہ'' کے الفاظ لکھ دیئے جائیں۔ (ادارہ)

محمد فیصل مقبول عجز

کلام اقبال کا ایک کردار۔۔۔ ابلیس

اقبال کی فلسفیانہ شاعری میں کائنات کے متحرک پہلو کی عکاسی بھرپور انداز میں ہوئی ہے۔ اقبال کی نظر میں کائنات کا وجود اسی صورت برقرار رہ سکتا ہے جب تک اس میں حرکت موجود ہے۔ کائنات کا جمود یا سکون نہ صرف انسانی زندگیوں کے لیے ہلاکت ہے بلکہ پوری کائنات کے لیے باعثِ زوال ہے۔ قرآن پاک کے نزدیک اس کائنات کی (جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں) نوعیت کیا ہے؟ اول یہ کہ اس کی آفرینش اس لیے نہیں ہوئی کہ تخلیق کا عمل ایک کھیل ہے۔

اقبال کے نزدیک اس (کائنات) کی ترکیب ہی اس طرح ہوئی کہ اس میں مزید وسعت کی گنجائش ہے۔ یہ کوئی جامد کائنات نہیں نہ ایک ایسا مصنوع جس کی تکمیل ختم ہو چکی اور جو بے حرکت اور ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ برعکس اس کے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باطن میں ایک نئی آفرینش کا خواب پوشیدہ ہے۔"[1]

کائنات کا نظام جسم کی مانند ہے جب جسم کا ہر حصہ اپنی پوری صلاحیت اور طاقت سے کام سر انجام دیتا رہتا ہے جسم تندرست و توانا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح کائنات کے عناصر جب تک حرکت میں رہتے ہیں، ورنظام کائنات میں معاون و مددگار رہتے ہیں کائنات میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جیسے ہی یہ عناصر انتشار کا شکار ہوئے نظام میں کسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔ کروڑوں سال پہلے ہماری زمین پر ہونے والے کسی بڑے حادثے کی وجہ سے کائنات میں بہت بڑے پیمانے پر تباہی رونما ہوئی اور اس کی جغرافیائی حدود کے ساتھ ساتھ یہاں بسنے والی تہذیبیں بھی نیست و نابود ہو گئیں۔

اقبال بدلتی ہوئی دنیا میں انسانی بقا کے لیے ان بنیادی عناصر کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

''اسلام کے نزدیک حیات کی یہ روحانی اساس ایک قائم ودائم وجود ہے جسے ہم اختلاف اور تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی معاشرہ حقیقت مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات وتغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اس کے پاس کچھ تو اس قسم کے دوامی اصول ہونا چاہیں جو حیات اجتماعیہ میں نظم وانضباط قائم رکھیں، کیوں کہ مسلسل تغیر کی اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی سے جما سکتے ہیں تو دوامی ہی کی بدولت۔ لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ اس سے تغیر وتبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے اس لیے کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔''[2]

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

اقبال نے اس کائناتی تصور حرکت کو بنیاد بنا کر اپنے کلام میں جا بجا حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے تاریخی واقعہ سے بحث کی ہے۔ ان کے ابتدائی کلام (بانگ درا) میں اس کردار پر سرسری بحث کی گئی ہے لیکن جوں جوں ان کی شاعری ترقی کی منازل طے کرتی جاتی ہے یہ کردار ان کی شاعری میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اپنے افکار وخیالات کے اظہار کے لیئے ایک جامع اور مربوط نظام فکر تشکیل دیا جس کی روشنی میں اقبال نے نہ صرف اپنے نظریات وفلسفیانہ افکار کی وضاحت کی بلکہ قوم کو بھی خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اقبال نے ابلیس کے حوالے سے قرآنی احکامات کو شعری قالب عطا کیا اور اس کی جزئیات سے بحث کی۔ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے خروج کا واقعہ اقبال کے لیے خاص توجہ کا مرکز ہے اور ان کی شاعری میں اس واقعہ کے مختلف حوالے ملتے ہیں۔ اسی طرح ابلیس کے کردار پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور اس کے مقاصد وعزائم سے ملت اسلامیہ کو باخبر کرتے ہیں۔

اقبال قرآن پاک کے اس حکم پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ یہ واقعہ محض ایک واقعہ نہیں بلکہ نسل انسانی کے لیے بہت سی حکمتوں کو بیان کرتا ہے۔ اقبال کے پہلے مجموعہ کلام بانگ درا میں نظم ''سرگزشت آدم'' کے ابتدائی چند اشعار[3] میں اس واقعہ کی جانب اشارہ ملتا ہے۔

اقبال کے کلام میں ابلیس کا کردار اپنی تمام تر خامیوں اور منفی و طاغوتی طاقتوں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اقبال کا ابلیس قوتِ حسن و عمل کا نمائندہ ہے۔ اقبال کو ابلیس کی ذات سے اس لیے سروکار ہے کہ وہ مایوس ہے لیکن اس کی مایوسی ہی کائنات میں تغیر وارتقا کا باعث ہے۔ ابلیس جس دن سے دربارِ خداوندی سے مردود قرار پایا اس دن سے وہ نسلِ انسانی کے خلاف منفی اور طاغوتی طاقتوں کو استعمال کر رہا ہے۔ وہ انسانوں کو غافل اور گمراہ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اقبال کو ابلیس کی ذات کا یہی متحرک پہلو عمل پیہم کا درس دیتا ہے۔

اقبال کو ابلیس سے اس لیے بھی سروکار ہے کہ وہ نسلِ انسانی کو عمل صالح سے روکنے پر قدرت رکھتا ہے لیکن فطرتِ انسانی عمل صالح کی طرف مائل ہوتی ہے یوں ابلیس کا کردار بنی نوعِ انسان کے لیے راہِ فلاح میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن یہی رکاوٹ انسان کو عمل صالح کی ترغیب دیتی ہے تاکہ ہم خدا کی خوشنودی اور اس کے انعام واکرام کے حق دار قرار پائیں۔

اقبال ابلیس کو شر کا نمائندہ تسلیم کرتے ہیں لیکن خیر وشر کی آزمائش میں ابلیسی کردار ایک مستقل عمل کا سبب ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ''اقبال کے نزدیک زندگی نفی واثبات دونوں پر مشتمل ہے۔ ارتقائے حیات میں ایک حالت کی نفی سے دوسری حالت کا اثبات ہوتا ہے اور آگے بڑھتے ہوئے بھی اسی اثبات کی نفی ہو جاتی ہے۔ نفی سے اعلیٰ تر اثبات کی طرف یا اقبال کی اصطلاح میں استحکامِ خودی کی طرف مسلسل قدم اٹھنا چاہیے۔ اثبات مسلسل نفی مسلسل کے بغیر نہیں ہو سکتا لہٰذا نفی بھی خیر مطلق کے حصول کے لیے لازمی ہے۔''

اقبال اپنی نظم ''جبریل و ابلیس'' میں ابلیس سے دنیا کے بارے میں کہلواتے ہیں۔ ''سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو'' (یعنی اس کائنات میں جمود و سکون کا نام نہیں ہر طرف تغیر ہی نظر آتا ہے۔) جنت میں واپس نہ جانے کی خواہش ابلیس سے یہ کہلواتی ہے۔

آہ اے جبریل! تو واقف نہیں اس راز سے	کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میرا گزر ممکن نہیں ممکن نہیں	کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ وکو!

دشمنی کا عملی ثبوت، حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوا کی لغزش، حضرت آدم علیہ السلام کا بے لباس ہونا اور پھر اسے شرم محسوس کرنا، حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر قیام حضرت آدمؑ کی توبہ استغفار، یہ تمام واقعات قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔۵؎

جب تخلیق آدمیت سے قبل لاتعداد فرشتے خدا تعالیٰ نے اپنی حمد و ثنا کے لیے پیدا فرما دیے تھے تو پھر تخلیقِ آدمیت میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ قرآن نے تخلیق آدمیت کی بے شمار حکمتیں بیان کیں ہیں۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں | اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

☆ خدائے بزرگ و برتر کے احکامات کی پابندی (امر بالمعروف و نہی عن المنکر)

☆ ابلیس کی سرکشی اور انسان دشمنی (خیر و شر کی آزمائش)

☆ حضرت آدم اور اماں حوا کا جنت میں قیام اور حکمِ خدا سے لغزش (جنت سے زمین کی جناب سفر)

☆ توبہ و استغفار اور رجوع الی اللہ کی ترغیب (دنیا میں قیام اور جہد مسلسل کا درس)

ابلیس پُر قوت، باعمل اور شدید ہیجان پرور جذبات کا مالک ہے یعنی صرف شر کا نمائندہ ہے۔ دوسری طرف انسان خیر و شر کا نمائندہ ہے یعنی انسان کی فطرت میں ملکوتی اور شیطانی دونوں عناصر پائے جاتے ہیں جو اس کی شخصیت میں ثنویت پیدا کرتے ہیں۔ جنت میں خیر و شر کا کوئی تصور نہیں ۔ یہ زمین ہی وہ میدان عمل ہے جہاں خیر و شر کے تصور سے انسان کی آزمائش مقصود ہے یہاں یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ انسان کو فقط تقدیر کے تابع نہیں کیا گیا بلکہ اس کے لیے نیکی و بدی کی راہیں متعین کرنے کے بعد اسے با اختیار کیا گیا ہے۔

اقبال کے ہاں ابلیس کا تصور اس کے فلسفۂ خودی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ خودی کی ماہیت میں ذاتِ الٰہی سے فراق اور سعی قرب و وصال دونوں داخل ہیں۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کی جان اس کا نظریۂ عشق ہے۔ عشق کی ماہیت آرزو و جستجو اور اضطراب ہے۔ اگر زندگی میں موانع موجود نہ

ہوں تو وہ خیر کوشی بھی ختم ہو جائے جس کی بدولت خودی میں بے داری اور استواری پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان کے اندر باطنی کشاکش نہ ہو تو زندگی جامد ہو کر رہ جائے۔ اقبال نے شیطان کی خودی کو بھی زور و شور سے پیش کیا ہے اور کئی اشعار میں تو شیطان کی تذلیل کی بجائے اس کی تکریم کا پہلو نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے اقبال جدوجہد کے مبلغ ہیں اور جدوجہد باطنی اور خارجی مزاحمتوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ خودی اپنے ارتقا کے لیے خود اپنا غیر پیدا کرتی ہے تاکہ اس کو جذب کرنے اور اس پر غالب آنے سے انسان روحانی ترقی کر سکے۔ ۷

انسان کے لیے جہدِ مسلسل کا سبق فطری ہے۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم: "آدم کا کمال اس کی سعی پیہم سے وابستہ ہے۔ اگر شیطان اس کو پہلی سکونی جنت سے نہ نکالتا تو اس کو یہ تگ و دو کہاں سے نصیب ہوتی۔ پہلی جنت جس سے شیطان نے نکلوایا۔ وہ بے کوشش یوں ہی بخشی ہوئی جنت تھی۔ اب آدم اپنی مساعی سے جو جنت بنائے گا وہ اس کے خونِ جگر کی پیداوار ہوگی۔ وہ اس کی اپنی کمائی ہوگی۔" ۷

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں　　آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

(روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے)

اس میدانِ عمل میں انسان کو خیر و شر کی آزمائش سے گزر کر اپنا مقام حاصل کرنا ہے جو انسان اس آزمائش میں پورا اترے گا اس کا ٹھکانہ جنت ہے جو انسان کا قدیمی و حقیقی مسکن ہے اور جو سرکشی کرے گا اور ابلیس کے نقشِ قدم پر چلے گا اس کا مقام دوزخ (ھاویہ بھڑکنے والی) ہے حتیٰ کہ وہ جانتا ہے کہ ابلیس اس کا کھلا دشمن ہے۔ (سورۃ الاعراف "دوسرا رکوع") ۸

سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن　　تری سرشت میں ہے کوکبی و مہ تابی

ابلیس شر کا نمائندہ ہے اس کردار میں وہ تمام حوالے موجود ہیں جو نسلِ انسانی کے لیے روز

ازل سے باعثِ عتاب (۹) ہیں اس کا اولین مشن یا مقصد ہی آدمیت کی تذلیل اور خدا کی نافرمانی ہے۔ ۱۱

شیطان کی حیثیت اس ڈاکو کی سی ہے جو آدمیت کو لوٹنے کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس کے پاس بے شمار بیرونی (دولت، حرص، لالچ، حکمرانی، شہرت اور سیاست کا نشہ) اور اندرونی (انسانی نفس و نفسانی خواہشات) حربے کارگر ہیں جن سے وہ انسان دشمنی کا عملی ثبوت دیتا ہے۔ شیطان اور اس کے حواری نسلِ انسانی کو گمراہ کرنے پر کمربستہ ہیں ان میں جن اور انسان سب شامل ہیں جو بے شمار شکلوں اور حیثیتوں سے ابلیس کی خدمت کر رہے ہیں۔ اقبال شیطانی، طاغوتی اور ابلیسی وسواس کے لیے "ابلیسیت" کی علامت استعمال کرتا ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود

مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

ابلیس ایک تاریخی حوالہ ہی نہیں بلکہ نسلِ انسانی کے لیے حقائق کا سرچشمہ ہے۔ اقبال کو حضرت آدم کی تخلیق سے لے کر زمیں پر اُترنے تک کے واقعات میں ابلیس کا کردار ہی سب سے جان دار اور متحرک نظر آتا ہے۔ جس سے کائنات میں خیر و شر کی آزمائش کا آغاز ہوا۔ ابلیس کی ابدی زندگی (یعنی روزِ قیامت تک کی مہلت) میں انسان کے لیے جہدِ مسلسل کا سبق ہے۔

ترجمہ: اللہ نے فرمایا: اے ابلیس تجھ کو کس چیز نے روکا کہ اسے سجدہ نہ کرے جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا۔ کیا تو کچھ گھمنڈ میں آگیا ہے؟ یا تو بڑے درجے والوں میں سے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں اس سے بہت بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے بنایا۔ ارشاد ہوا کہ یہاں سے نکل جا۔ تو مردود ہوا۔ اور تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت اور پھٹکار ہے۔ کہنے لگا۔ میرے رب مجھے لوگوں کے اُٹھ کھڑے ہونے (قیامت تک) کے دن کی مہلت

دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو مہلت والوں میں سے ہے۔ متعین تاریخ کے وقت تک۔ کہنے لگا پھر تو تیری عزت کی قسم میں ان سب کو یقیناً بہکادوں گا (سورۃ ص: رکوع ۵) [۱۰]

دُنیا میں انسان کو جس آزمائش میں مبتلا کیا گیا ہے اس کا محرک اولین ابلیس قرار پایا ہے جس سے برسرِ پیکار ہونے اور اس کے خلاف صف آرا ہونے میں نجات ہے اور آخر میں حصول جنت کی ضمانت بھی۔ ابلیس ان تمام سفلی اور خبیث طاقتوں کا نمائندہ ہے ابلیس یا شیطان کی ماہیت کیا ہے؟ یہ بھی اسرار حیات میں ایک سربستہ راز ہے۔ کیا ابلیس زندگی کے کسی مظہر کا نام ہے یا وہ کوئی آمادہ بہ شر شخصیت ہے؟ کیا وہ کوئی زوال یافتہ باغی فرشتہ ہے یا اس جناتی مخلوق کا امام ہے جسے قرآن نے ناری قرار دیا ہے؟ لیکن خود نار کیا ایک استعارہ ہے یا دنیا کی آگ کی طرح جلانے اور بھسم کرنے کا ایک عنصر ہے۔

قرآن و حدیث میں شیطان کے متعلق جو تصورات ملتے ہیں ان کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور حکمت آموز بھی۔ ابلیس کی اگر کوئی ایک شخصیت ہو تو وہ ایک وقت میں ایک جگہ عمل کرتی ہوئی نظر آئے، لیکن حدیث شریف میں ہے کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا شیطان لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک صحابی نے ذرا جرأت سے پوچھا کہ کیا حضورؐ کے ساتھ بھی؟ فرمایا۔ ہاں میرے ساتھ بھی ہے مگر میں نے اسے مومن بنا رکھا ہے۔ حضورؐ کا شیطان تو مومن ہو گیا لیکن کفار کے ساتھ لگا ہوا شیطان کافر ہی رہا۔ اور پھر شیطان ایک تو نہ ہوا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ شیطان انسان کی رگ وپے میں اور اس کی روح کی گہرائیوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ اس بیان میں شیطان کوئی شخصیت معلوم نہیں ہوتا بلکہ زندگی میں ایک تخریب انگیز میلان کا نام ہے [۱۱]

انسان کو اس عارضی دُنیا میں دولت، شہرت اور حکمرانی سے گمراہ کرتا ہے اس کے لیے تمام قواعد و ضوابط مقرر کر دیے ہیں تو آخر وہ کون سا محرک ہے جو اسے ان اصول و قواعد کی بغاوت پر اُبھارتا ہے یقیناً وہ ابلیس ملعون ہی ہے۔ اس نے اپنے بُرے عزائم کے لیے جن اور انسانوں کا ایک لشکر تیار کر رکھا ہے جو اس کی ایما پر نسل انسانی کو گمراہ کرنے پر کمربستہ ہے دور حاضر میں

ہونیوالے بم دھماکے، خودکش حملے اور ٹارگٹ کلنگ (Target killing) نسلِ انسانی کو تباہ کرنے کے شیطانی حربے اور منصوبے ہیں جن کے تحت وہ ملعون بے گناہ انسانوں کو ورغلا کر اس گناہ کبیرہ پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اقبال نے اپنے دور میں ایسے ہی ایک ابلیسی حربے کی نشان دہی کی ہے جسے وہ سیاستِ افرنگ کا نام دیتے ہیں۔

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

اقبال اہلِ سیاست (بالخصوص سیاست افرنگ) کو ابلیس کے کارندے (حواری) کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک افرنگی سیاست ابلیس کی نمائندہ طاقت ہے جو برصغیر میں نسلِ انسانی کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنانے پر مصر ہے۔

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

اقبال اپنی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیسی سازشوں اور انسان دشمنی سے بحث کرتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے شیطانی پارلیمنٹ اور ان کے عزائم کا پردہ فاش کرتے ہیں۔ اگر اس نظم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی روشنی میں پرکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے کتنی مہارت اور چابک دستی سے ان احکاماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی فلسفیانہ فکر میں ڈھال کر بہ صورت نظم پیش کیا ہے۔ یہی نہیں اس نظم میں اقبال نے بہ زبان ابلیس امتِ محمدیہ کی خوابِ غفلت سے بیداری کا خوف بھی واضح کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک اس ملت کی بیداری کا مطلب ایک قوم کی بیداری نہیں بلکہ دنیا کی بیداری ہے۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر

اس نظم میں مسلمان کی تصویر اس کے نازک خط و خال کے ساتھ کھینچ گئی ہے اور اس کے ساتھ

ہی دوسرے افکار و مذاہب و نظریات اور ان کے قائدین پر بھی روشنی پڑ گئی ہے۔

حاصلِ کلام:

اقبال کے نظامِ فکر میں شیطان کا کردار شر کا نمائندہ ہے لیکن یہ اس کائنات میں تغیر و تبدل کا بھی پیش خیمہ ہے۔ کائنات میں خیر و شر کی کشمکش میں شیطان کی حیثیت فریق کی ہے جس کے وجود کے بغیر خیر و شر کا ادراک ممکن نہیں۔ اقبال کے نظامِ فکر میں ابلیس پُر قوت ہے' باعمل ہے' شدید اور ہیجان پرور جذبات کا مالک ہے۔ اقبال کا شیطان نطشے کے تصورِ شیطان جیسا نہیں ہے نطشے شیطان سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے واقعی ایک مردود چیز ہے۔ یہ شیطان زود و پستی کا شیطان ہے وہ بجائے خود پستی ہے۔ اس کے برعکس اقبال اپنے شیطان سے سروکار رکھتا ہے۔ ان کا شیطان دفت حسن اور عمل کا نمائندہ ہے۔ وہ جبرائیل علیہ السلام کی طرح خیر و شر کا تماشائی نہیں اس بحرِ ذخار کا تیراک ہے۔ یہ شیطان پُر قوت ہے۔ باعمل ہے شدید اور ہیجان پرور جذبات کا مالک ہے۔ نطشے اپنے شیطان کو گلے نہیں لگاتا کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی فطرت میں پستی اور حقارت کا عنصر ہے۔ وہ شیطان سے اس لیے آنکھیں نہیں ملاتا کیوں کہ وہ اپنی شناخت' اپنی بلندی' قوت' اور اپنی توانائی سے کرتا ہے لہٰذا اس کا شیطان بد فطری کے متضاد پہلوؤں کا نمائندہ ہے۔ اقبال اپنے شیطان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا سامنا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں شیطان کا کردار پوری طرح اُبھر کر سامنے آیا ہے۔

حوالہ جات

۱ ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' پہلا خطبہ بنام ''علم اور مذہبی مشاہدات'' از سید نذیر نیازی' بزمِ اقبال' کلب روڈ لاہور جنوری ۲۰۰۰ صفحہ نمبر ۲۲۱

۲ ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' چھٹا خطبہ بنام ''الاجتہاد فی الاسلام'' از سید نذیر نیازی' بزمِ اقبال' کلب روڈ' لاہور' جنوری ۲۰۰۰' صفحہ نمبر ۲۲۱

۳ نظم: "سرگزشتِ آدم بانگِ درا حصہ اول"

۴ ماخذ "فکرِ اقبال" از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، بزمِ اقبال لاہور جنوری ۲۰۱۰ (عنوان: ابلیس سترھواں باب) صفحہ ۴۴۳

۵ قرآن پاک نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ واقعہ تقریباً سات ۷ جگہوں پر بیان کیا ہے۔ تفصیل یوں ہے۔

(۱) سورۃ البقرہ۔۔ آیات (۳۹۔۳۰) (۲) سورۃ الاعراف ۔۔۔ دوسرا رکوع (۳) سورۃ الحجرات ۔۔ تیسرا رکوع (۴) سورۃ ص ۔۔ پانچواں رکوع (۵) سورۃ اسرائیل ۔۔ ساتواں رکوع (۶) سورۃ الکہف ۔۔ ساتواں رکوع (۷) سورۃ طٰہٰ ۔۔ ساتواں رکوع

قرآن نے اس کے علاوہ بھی ابلیس کی انسان دشمنی اور شیطانی ترغیبات کو کھول کھول کر بیان کیا ہے اور اس واقعہ کے حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔

۶ ماخذ "فکرِ اقبال" از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' بزمِ اقبال لاہور' جنوری ۲۰۱۰ (عنوان: ابلیس' سترواں باب) صفحہ ۴۵۰

۷ ماخذ "فکرِ اقبال" از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بزمِ اقبال لاہور جنوری ۲۰۱۰ (عنوان: ابلیس سترھواں باب) صفحہ ۴۵۵

۸ بنی آدم قد انزلنا ۔۔۔۔۔ انّہٗ لا یحبّ المسرفین (سورۃ الاعراف" دوسرا رکوع)

۹ باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

۱۰ قل انّما انا منذر وّ ما من ۔۔۔۔ و لتعلمنّ نبأہٗ بعد حین (سورۃ ص. رکوع ۵)

۱۱ جاوید نامہ (فارسی) میں ابلیس کے متعلق دو نظمیں ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "نمودار شدن خواجۂ اہلِ فراق ابلیس" اور دوسری نظم کا عنوان "نالۂ ابلیس"

۱۲ اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کا مطالعہ ان احادیث کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے قرآن پاک اور احادیث نبوی صلی علیہ وسلم کو اپنے کلام میں جابجا بیان کیا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال نے قرآن و حدیث کی صحیح معنوں میں اپنے کلام میں نمائندگی کی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

*****

محمد طارق غازی (آٹوا۔کینیڈا)

زاہد شوکت علی

مولانا شوکت علی کے سپوت، مولانا محمد علی جوہر کے بھتیجے اور داماد، بمبئی کے مرحوم خلافت ہاؤس کے آخری تاجدار، زاہد شوکت علی، سے میری ملاقاتیں دو تین بار سے زیادہ نہیں ہوئیں۔ اگر صرف انداز گفتگو ہی کو فیصلہ کن مان لیا جائے تو وہ اقبال کا شاہین تھے" نرم دم گفتگو"۔۔۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں پھونک پھونک کے بات کرتے تھے خندہ رُو ایسے کہ کہیں سے نہیں لگتے تھے ان کا کوئی تعلق رامپور سے تھا یا اصلی نسلی پشتون قبیلہ کے چشم و چراغ تھے اجی رامپور کیا، اس انداز گفتگو سے تو وہ طوطی شعلہ بیاں مولانا محمد علی جوہر کے بھتیجے بھی نہ لگتے تھے مگر تھے اصلی رامپوری اور سگے بھتیجے اس بلبل حریت کے جس نے غربت کی موت کو غلامی کی موت پر ترجیح دی تھی اور پٹھان کی بات کو پتھر کی لکیر بنا دیا آخر تھے تو یوسف زئی مولانا محمد علی جوہر کی یادوں پر تو ایک مستقل مضمون درکار ہے سو وہ فہرست میں شامل ہے ان لوگوں کے ذکر کی فہرست میں جس سے میں کبھی نہ مل سکا تھا مگر جن کی بارگاہ سے میں کبھی غیر حاضر نہ رہا۔

کسی زمانے کے عروس البلاد بمبئی میں بائیکلہ کے علاقہ میں محبت گلی، عین لولین کے قلب میں واقع خلافت ہاؤس کی بالائی منزل کے ہال میں زاہد شوکت علی کا دربار لگا کرتا تھا عموماً بزرگوں کا مجمع ہوتا تھا اس مجمع میں زاہد شوکت علی کے چھوٹے بھائی عابد علی بطور تابع مہمل کے موجود رہتے تھے حالانکہ اس وقت انہیں نچلی منزل پر روزنامہ خلافت کے دفتر میں ہونا لازم تھا جس کے وہ آخری اڈیٹر تھے مگر خیر یہ ایسا بڑا عیب نہ تھا کہ آدمی زاہد شوکت علی کے دیوان خاص میں باریاب نہ ہو سکے ویسے آزادی کے بعد کی روایت کے مطابق اردو اخبارات میں اکثر ان ڈیٹروں کا دفتر میں موجود ہونا ضروری خیال نہیں کیا جاتا جن کا نام لوح

اخبار پر شائع ہوتا ہے عام طور سے دفتر میں تاوقت موجودگی کا یہ کام کوئی نائب ایڈیٹر قسم کا شخص زیادہ حسن انتظام کے ساتھ کر لیتا ہے، بلکہ اداریہ بھی لکھ دیتا ہے خبروں کا ترجمہ بھی کر دیتا ہے ان پر سرخیاں بھی لگا دیتا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو کتابت تک کر دیتا تھا بہر حال، عابد علی مہمانوں کی تواضع میں پیش پیش رہتے۔

ان مجلسوں میں دو ایک بار میں والد صاحب، مولانا حامد الانصاری غازی، کے ہمراہ خلافت ہاؤس گیا تھا وہاں میرا وجود کان تک محدود تھا جو کچھ لوگ بول رہے تھے میں بس سن رہا تھا اور باتیں عام طور سے کوئی ایسی یاد رکھنے کے قابل بھی نہ ہوتی تھیں ہنگامی سیاست پر جذباتی تبصرے تو اس لیڈر کو یہ ذہن میں رہتے جو عموماً خود کو ملک و قوم کے وجود کا واحد سبب سمجھ بیٹھتا ہے اسی لیے ان میں سے کوئی بات اب یاد نہیں اور یاد ہو بھی تو یہ بھی تو بتانا پڑے گا کہ مدعو کر راؤ چودھری کون تھے بات سے زیادہ طویل تو اُن کا تعارف ہو جائے گا ہاں دو ایک باتیں یاد رہ گئیں جن میں سے ایک زاہد شوکت علی سے میری اچھی راست ملاقات کی ہے اور دوسری بات کا ذکر والد صاحب نے ایک بار کیا تھا ان دو باتوں کی وجہ سے زاہد شوکت علی لوگوں کو یاد رہ جائیں تو وہ بڑے آدمی ہوئے مجھے وہ یاد ہیں۔

ہوا یوں تھا کہ ان دنوں ایک امریکی خاتون والد صاحب سے ملنے کے لیے آئیں نام تو مجھے ان کا یاد نہیں رہا تھا لقب یاد رہ گیا تھا ان کا مسز گراہم۔ بعد میں نوید مسعود صاحب نے اس موضوع پر میرا خط پڑھ کر تحقیق کی اور مسز گراہم کو امریکہ کی یونیورسٹی آف ٹیکساس میں ڈھونڈ نکالا تھا مسز گراہم سے طلاق کے بعد اب وہ پروفیسر گیل منالٹ کے نام سے علمی دنیا میں معروف ہیں، اردو ہندی روانی سے بولتی ہیں اور ۱۹۷۲ میں بیسویں صدی کے آغاز کی ہندوستانی مسلم قیادت پر مقالہ کی اساس پر امریکہ میں حکیم فلسفہ تسلیم کی گئیں۔

اُس زمانے میں مسز گراہم کے پہلے شوہر اصل میں تو یونائیٹڈ سٹیٹس جیولوجیکل سروے میں برسر کار تھے مگر ان دنوں لکھنؤ میں جیولوجیکل سروے آف انڈیا سے پتہ نہیں کیوں وابستہ تھے مسز گراہم تب تحریک خلافت پر پی۔ ایچ ڈی کے لیے لوازمہ جمع کر رہی تھیں یہ یاد نہیں یہ موضوع

لکھنؤ کے قیام کا اثر تھا یا اس موضوع کے اثر سے ان کے شوہر نے لکھنؤ کا انتخاب کیا تھا۔

بہر حال مسز گراہم یعنی گیل نے خلافت تحریک کے بارے میں والد صاحب سے کافی دیر بات کی مجھے پتہ نہیں ان کے مقالے میں کہیں والد صاحب کا حوالہ ہے کہ نہیں عام طور سے ایسے مقالوں میں ایسی بات چیت اپنے منتخبہ موضوع کے پس منظر میں گھسنے کا چور دروازہ ہوتی ہے اس لیے مقالہ نگار اسے راز میں رکھتے ہیں اس سے علمی تحقیق کو وقار ملتا ہے اور آدمی بڑا محقق بنتا ہے اسی طرح۔

بہر حال، مقالہ برطرف، بات چیت کے بعد مسز گراہم نے اس دوپہر کا کھانا بھی ہمارے ساتھ ہی کھایا۔ دستر خوان پر وہ دیر تک والدہ ہاجرہ نازلی اور میری نانی۔ اہلیہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب، جو اتفاق سے بمبئی (ممبئی نہیں ہوتا تھا تب) سے آئی ہوئی تھیں۔ کے ساتھ خالص زنانہ موضوعات پر باتیں کرتی رہیں اور ثابت کرتی رہیں کہ عورت کو لاکھ پی ایچ ڈی کروالو وہ رہے گی عورت کی عورت ہی: جب بھی دوسری عورت سے ملے گی تو موضوع دوپٹے کا گوٹہ کناری، ہاتھ کے کڑے، بڑے بھیا کے ہاں پوتے کی ولادت وغیرہ ہی ہو گئے۔ امی نے مسز گراہم کو تحفے میں کچھ کڑے چوڑیاں وغیرہ بھی دی تھیں۔ اس دن مسز گراہم سفید کھدر کا چوڑی دار پاجامہ اور سبز کھدر کا کرتہ زیب تن کئے ہوئے تھیں اور گردن میں سفید کھدر کا دوپٹہ بھی حائل تھا فقط رنگ اور قامت کی وجہ سے امریکن رہ گئی تھیں اس پر روانی سے اردو بولنے کی صلاحیت بس یہی غضب ہوا تھا اپنے موضوع پر تحقیق کے لیے انہیں وہ لوازمہ ملا کہ شائد آج تک یاد کرتی ہوں

دوران گفتگو والد صاحب نے خلافت ہاؤس کا ذکر کیا تو قدرتی طور پر مسز گراہم کو وہاں جانے سے دلچسپی ہوئی والد صاحب نے زاہد شوکت علی کو فون پر اطلاع دی تو وہ فوراً ہی ملنے کو تیار ہو گئے اور بلا تاخیر بلا بھیجا انہیں زاہد صاحب کے حریم فکر تک لے جانے کی ذمہ دار مجھے تفویض ہوئی۔

زاہد شوکت علی بڑوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے تہذیب تمیز کا رچاؤ ان کی شخصیت کا رنگ روپ تھا آخر رامپور بھی تو ان مرکزوں میں سے تھا جہاں ہمارے دیس کی تہذیب گنگا جمنی بنی تھی

مسز گراہم خلافت ہاؤس میں وارد ہوئیں تو زاہد صاحب تپاک سے ملے مگر نوابی رکھ رکھاؤ کے ساتھ کسی زردار کی طرح طرفۃ العین میں آپے سے باہر نہیں ہو گئے احترام کے ساتھ مسز گراہم کو ہال میں لا بٹھایا چائے بسکٹ پیسٹریاں وغیرہ منگوائیں اور ان کی صفات بیان کر کے بڑی نفاست سے میزبانی کا حق ادا کرتے رہے۔

ابتدائی تکلفات کے بعد گفتگو کچھ یوں آگے بڑھی کہ مسز گراہم نے مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں سوال کیا تو جواب ملا کہ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ان کا نام بہت اہم ہے، اور احمدی بیگم چھوپڑا بہت اچھی مغنیہ ہیں مسز گراہم نے کہا، کچھ اپنے والد کا ذکر کیجئے تو جواب آیا کہ ہاں وہ بہت بڑے آدمی اور ممتاز قومی رہنما تھے، اور احمدی بیگم غزل خوب گاتی ہیں، مسز گراہم نے کہا خلافت عثمانیہ کے حق میں ہندوستان میں اس تحریک کا مقصد کیا تھا تو فرمایا خلافت عثمانیہ اور خلافت تحریک ختم ہوئے تو عرصہ ہو گیا البتہ احمدی بیگم چھوپڑا کا ایک پروگرام تو آج رات ہی کو ہے آپ ضرور محظوظ ہوں گی۔

جب مسز گراہم فرمانروائے خلافت ہاؤس کی معلومات سے حد درجہ مرعوب ہو گئیں تو انہیں ہال کے کونے کونے، در و دیوار اور میز میز آراستہ علی برادران اور دیگر رہنمایان خلافت تحریک کی قدیم تاریخی تصاویر میں دلچسپی لینی شروع کی، کسی تصویر کی تفصیل پوچھتی تو جواب میں پھر احمدی بیگم نے جھانکا کہا میرا ارادہ تو نہ تھا مگر آپ کی خاطر..... میں احمدی بیگم کو اطلاع کروا دیتا ہوں چندے اور قیام کریں تو ان کی ایک خصوصی بزم سجادی جائے بہت خیال فرماتی ہیں.....

سبز و سفید پوش مسز گراہم نے اس ملاقات کے دوران پہلی بار میری طرف دیکھا اور نگاہوں سے سوال کیا کہ چلیں؟ تو میں نے زاہد شوکت علی سے کہا کہ آج تو مسز گراہم سخت مصروف ہیں اور کل واپس لکھنؤ چلی جائیں گی آئندہ کبھی بمبئی تشریف لائیں گی تو آپ احمدی بیگم چھوپڑا کو زحمت دیجئے گا زاہد شوکت علی نے ادنیٰ درجہ میں بھی کبیدگی ظاہر کئے بغیر مسز گراہم کے تشریف لانے اور گفتگو کا شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ وہ تحریک خلافت پر ایک اچھا مقالہ تحریر کریں گی دروازہ تک

الوداع کہنے کے لیے آئے۔ یہ مسز گراہم کی اچھی تربیت کا مظہر تھا کہ واپسی کے راستہ بھر انہوں نے اپنے اس اہم انٹرویو پر کوئی تبصرہ نہیں کیا بس بمبئی کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں اس دن کے بعد وہ دوبارہ پلٹ کر بمبئی نہیں آئیں اور آئی بھی ہوں تو اب زاہد شوکت علی بھی نہ رہے کہ انہی سے پوچھ لیتے۔

زاہد شوکت علی صاحب کے بارے میں دوسری بات کا ذکر والد صاحب نے کیا تھا زاہد صاحب کی شادی ان کے چچا مولانا محمد علی جوہر کی صاحبزادی سے ہوئی تھی وہ پاکستان چلی گئی تھیں زاہد صاحب نہ جانے کیوں ہندوستان میں رہنے پر بضد تھے میں اس بات کی تعریف کرتا ہوں قوم پروری کے جذبے سے نہیں، بلکہ اس لیے کہ ممکن ہے یہ بزرگوں کی (منقولہ) میراث سے روائتی زمیندارانہ وابستگی کا نتیجہ ہو ادھر حکومت ہند کو انہیں دوبارہ ہندوستانی تسلیم کرنے میں وہی روائتی تامل تھا کہ انہیں داغ لگ چکا تھا وہ پاکستان چلے گئے تھے اور پھر ہندوستان واپس آئے تھے چنانچہ ان کے قیام ہند کا معاملہ معلق تھا بیوی اصرار کر رہی تھیں کہ جب بات نہیں بن رہی تو واپس پاکستان آجاؤ مگر معلوم ہوا کہ رانی اگر لیکئی نہ ہو تو تریاہٹ کو راج ہٹ کے سامنے ہار ماننی پڑتی ہے تو والد صاحب نے بتایا کہ جب زاہد صاحب ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو بنت جوہر خود ہندوستان آئیں اور دلی میں سیدھی جواہر لال نہرو کے پاس پہنچ کر خوب بگڑیں۔ شوہر کی طرف اشارہ کر کے نہرو جی سے کچھ یوں کہا:

یہ پاگل شخص کسی کی نہیں سنتا میری بھی نہیں اس کی ضد ہے ہندوستان ہی میں رہنے کی اسے یہیں کہیں پڑا رہنے دو اتنی زمین نہیں لے گا کہ ہندوستان میں جگہ کا کال پڑ جائے کیوں تم اور تمہاری حکومت اسے دفتروں میں ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہو اس کا نہیں تو کچھ اس کے باپ اور چچا کا خیال کر لو۔۔۔۔

نہرو پروردہ تہذیب بھی تھا اور بی اماں کی پوتی کے سامنے بولنے کی تاب بھی نہ رکھتا تھا کہا انہیں کون یہاں سے نکال سکتا ہے بے شک یہ یہاں رہیں گے اور بلا روک ٹوک جب چاہیں کہیں

بھی جا آسکتے ہیں۔

فوراً کاغذات تیار ہوئے بنت محمد علی جوہر اگلی سواری سے واپس پاکستان چلی گئیں اور زاہد شوکت علی نے بمبئی آ کر خلافت ہاؤس کو دوبارہ آباد کیا اور اپنا دارالحکومت بنایا۔

اتنی بات ضرور ہے کہ زاہد صاحب کے دم تک خلافت ہاؤس خلافت ہاؤس رہا اور وہاں سے روزنامہ خلافت بھی شائع ہوتا رہا، اس سے قطع نظر کہ نہ وہ بازار میں نظر آتا تھا نہ اسے کوئی پڑھتا تھا ان کے انتقال کے بعد خلافت ہاؤس کی وسیع عمارت میں کالج قائم کر دیا گیا خیر یہ تو اچھا ہوا، مگر پتہ نہیں اس کالج کا نام خلافت کالج ہے یا رفیق ذکریا نے کچھ اور تجویز کر دیا تھا کہ ہندی میں پڑھے لکھے لوگوں کے نزدیک خلافت کا مطلب اختلاف ومخالفت ہونے لگا ہے مجھے بمبئی سے نکلے تیس سال سے زائد عرصہ ہو گیا، ایک دو بار جانا ہوا تو وقت اتنا تنگ تھا کہ شہر کے تفصیلی مطالعہ اور آموختہ کا موقعہ نہ تھا اب پتہ نہیں وہ شہر جہاں میں اپنا بچپن ڈھونڈھتا رہ گیا تھا ابھی زندہ ہے یا باقی ملک کی طرح اپنی جون بدل چکا ہے۔

شہر ہو یا ملک، ممبئی، دہلی، لینڈ، عمارت کا نام تھوڑی ہوتا ہے بستی تو انسانوں سے بنتی ہے ویرانے میں پڑی خالی عمارت میں وحشت آباد ہو جاتی ہے شہر کے بیچوں بیچ جنگل بھی ہو تو رونق کا باعث بن جاتا ہے بمبئی تو اور بھی پھیل گئی مگر وہ لوگ اب وہاں کہاں رہ گئے جن سے وہ تہذیب کی بستی ہوتی تھی۔ جو نئی پود وہاں ابھر کر آئی ہے اس کی تہذیب کا ایک آدھ نمونہ دیکھ کر تو ہول آنے لگا اس پر کبھی اور بات کریں گے، رہے نام اللہ کا۔

———

نیلم احمد بشیر

شانِ بے نیازی

میری بیٹی نے مجھے اپنے دفتر سے فون کر کے بتایا کہ وہ سیدھی میری طرف آ رہی ہے۔ اپنے گھر وہ بعد میں جائے گی۔ سنتے ہی میرے دماغ کے کمپیوٹر کا ماں حصہ فوراً حرکت میں آ گیا۔ ذہن کی لہریں اِدھر اُدھر دوڑنے، ہر قسم کے تار سنگنل پھلانگنے لگیں۔ بچی آ رہی ہے بھوکی ہوگی اس کے کھانے کے لیے کیا کروں کل والی دال" اونہوں! اسے اچھی نہیں لگے گی۔ آلو کی بھجیا؟ نہیں نہیں اسے مزا نہیں آئے گا۔ کیوں نہ فریزر میں ڈبکی لگاؤں اور دیکھوں کہ کیا کیا پڑا ہوا ہے۔ میں نے سوچتے ہی فوراً پٹ سے فریزر کا دروازہ کھول دیا اور اندر پڑے ذخائر کا جائزہ لینے لگی۔ کیوں نہ مچھلی ہی فرائی کر لوں۔ بیٹی کو بھی پسند ہے۔ میں نے مصالحہ لگی مچھلی کا منجمد پیکٹ باہر گھسیٹتے ہوئے سوچا۔ ارے یہ کیا؟ یہ تو صرف دو ہی ٹکڑے ہیں چلو کوئی بات نہیں ایک وہ کھا لے گی اور ایک میں تو بس ٹھیک رہے گا۔ میں نے مطمئن ہو کر فیصلہ کیا اور مچھلی کے ٹکڑوں کو قدرے نرم ہونے کے بعد تلنے کے لیے گرما گرم گھی میں چھوڑ دیا۔ تلی ہوئی مچھلی کے ٹکڑے سرخ ہوتے رہے تو فضا میں اشتہا انگیز خوشبو پھیلنے لگی میں نے چولہے کی آنچ دھیمی کر دی اور خود ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول تھامے لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھ کر لمحہ بہ لمحہ بدلتی ملکی صورت حال کا جائزہ لینے لگی۔ یکا یک میری نظر گھر کے میں دروازے پر جا ٹکی۔ جالی کے پار وہ خاموشی سے بیٹھی گھر کے اندر کا نظارہ کر رہی تھی۔ اُس کا یوں میرے گھر کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنا مجھے بہت کھلا۔ یوں لگا جیسے وہ میری پرائیوسی میں مخل ہو رہی ہو۔ فرمائیے؟ میں نے دل ہی دل میں اس کو مخاطب کر کے اس سے سوال کیا۔ جانتی نہیں میں کیوں آئی ہوں؟ یکا یک اس کی بولتی آنکھوں نے جواب دیا۔ میں ٹھٹھک کے رہ گئی گھبرا کر بولی۔ کیا مطلب بھئی مچھلی کی خوشبو مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ اتنی آسان سی بات تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہی۔؟

ہاں مگر۔۔۔وہ تو میں نے اپنے اور اپنی بیٹی کے لیے فرائی کی ہے۔اب اتنی مہنگی مچھلی میں تمہیں تو کھلانے سے رہی۔میں نے ڈھیٹ سی ہو کر اسے جتا دیا" کیا کہا! مجھے مچھلی پسند نہیں؟ اور کیا میں کسی کی بیٹی نہیں ہوں۔مجھے بھی بھوک لگی ہے"۔اس کی آنکھیں مسلسل بحث کرتی چلی گئیں۔میں خاموش ہو گئی۔خفت سی محسوس ہونے لگی۔واقعی کیا اس گلی گلی پھرنے والی کا میری اس مچھلی پہ کوئی حق نہیں ہے۔میرے دل سے خود ہی سوال اٹھا۔

ہاں مگر یہ لوگ کونسا روز روز تازہ گوشت مچھلیاں کھاتے ہیں۔کھوڑے ہی کھنگالتے ہیں تو پھر کھنگال لیں۔کچھ تو مل ہی جاتا ہے نا آخر؟ پیٹ تو بھر ہی لیتے ہیں نا۔۔۔میں نے خودغرضی سے سوچا۔ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے۔ہمارے لیے کوڑا کرکٹ، بچی کھچی ہڈیاں۔۔اور امریکہ انگلینڈ میں ہمارے ہم نسلوں کے لیے اعلیٰ غذائیت سے بھرپور، مخصوص ڈبہ پیک فوڈز کے نت نئے فلیورز۔۔اور پیاری لاڈلی بیٹی کے لیے، یہ فرائڈ فش۔۔واہ بھئی واہ۔۔۔بحث ختم ہوتی نظر نہ آ رہی تھی۔

اچھا یہ لو۔میں نے ایک پلیٹ میں رات کا بچا ہوا ڈال کر اس کے آگے خاموشی سے رکھ دیا۔میری بن بلائی مہمان تڑپ کر آگے بڑھی، دہی کو اپنے ننھے سکوڑ کو سونگھا پھر چکھے بغیر اسی طرح چھوڑ کر جالی والے دروازے کے دوسری طرف بیٹھ کر طنزیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔تم تو بڑی انصاف پسند، رحم دل بنی پھرتی ہو۔۔۔بس یہی دل نکالا ہے تم نے باسی کھلا رہی؟۔۔۔سبحان اللہ۔اس نظروں کی انی میری روح میں گھسی۔بھئی بڑے نخرے ہیں تمہارے۔آخر یہ بھی تو دودھ ہی ہے۔اب دودھ تم لوگ پیتی ہو کہ نہیں۔میں نے جل کر اس کی طرف بری سی شکل بنا کر دیکھا۔عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا اس نے مجھے۔

مچھلی پک چکی تھی۔میں نے اسے چکھنے کے لیے ایک ٹکڑے میں سے ذرا سا حصہ بھرا اور اسے کانٹے میں پرو کر مزے سے کھانے لگی۔کافی مزے دار بنی تھی۔میں اپنے والے ٹکڑے کو پورا کھائے بغیر نہ رہ سکی اور پھر ختم کرنے کے بعد ہڈیاں اٹھا کر اسی دہی میں مکس کر دیں۔سوچا اب تو

یہ محترمہ بھی کچھ خوش ہو ہی جائیں گی۔ آخر انہیں مکمل طور پر تو مچھلی سے محروم نہیں رکھ رہی ہوں۔

وہ پھر سے دہی والی پلیٹ کے قریب آئی مگر خالی ہڈیاں دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ چھونے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔ خوامخواہ شرمندہ کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔ میں نے نظریں نیچی ہی رکھیں۔ اس سے ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

ویسے میں نے بڑی کمینی حرکت کی ہے کیا ہو جاتا اگر اسے بھی تھوڑی سی مچھلی کھانے کو دے دیتی۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت کرنا شروع کر دی۔ میں بادل ناخواستہ ابھی اور فرائنگ پین میں سے مچھلی کا چھوٹا سا حصہ اتارنے کو آگے بڑھی۔ دروازے کی طرف گھومی تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں تو کوئی بھی موجود نہ تھا کہاں چلی گئیں محترمہ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ باہر کے گیٹ کی طرف دیکھا تو وہ شان بے نیازی سے گیٹ واک کرتی گھر سے باہر جاتی دکھائی دی۔ لو جی۔ شان دیکھو برا ہی مان گئی۔ میں نے حیرت سے سوچا۔۔۔ بڑی آئی کہیں کی۔۔۔ میں نے ہنکارا بھر کر دروازہ بھیڑ دیا۔

گذارش

بعض موصولہ نگارشات نظم و نثر "الاقربا" میں بوجوہ شائع نہیں کی جاسکتیں جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے تاہم ایسے مسودات کے محترم مرسلین سے گذارش ہے کہ وہ اپنی تحریروں کی نقل اپنے پاس محفوظ فرمالیا کریں کیونکہ ادارہ کے لئے انہیں واپس بھیجنا ممکن نہیں۔ شکریہ۔

نعیم فاطمہ علوی

مسیحا

دل نے دھڑکنا اور رو کنا ایک ساتھ سیکھا۔ میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں تھے جنھیں ڈھال بنا کر اپنا دفاع کر سکتی۔ وہ با اختیار تھا، سو جیت گیا۔ میں بے اختیار تھی، میں ہار گئی۔ نہ دوائیں کام آئیں نہ دعائیں، نہ التجائیں۔۔۔۔۔ زندگی ایک نحیف عورت کو بے دردی سے کچلتی ہوئی گزر گئی

پیاس جب حد سے بڑھی تو میں سسکنے لگی۔ سسکتی ہوئی زندگی دم توڑنے لگی تو مسیحا نے کہا۔ لو ایک گھونٹ پانی کا پیو اور جیو۔۔۔ تمہارا تڑپنے، سسکنے اور بیچارگی سے دیکھنے کا انداز ہی تو اچھا لگتا ہے۔۔۔ یہ محل میں نے تمہارے لیئے ہی تو سجایا ہے۔۔۔ تم اسے آباد رکھو گی۔۔۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔

تمہیں کیا چاہیے؟۔۔۔ روٹی، کپڑا، اور مکان۔۔۔۔

سب کچھ ہی تو ہے تمہارے پاس۔۔۔ اور کیا چاہتی ہو۔۔۔۔

زندہ رہنے کے لیئے ایک عورت کے پاس۔۔۔ اور کیا ہونا چاہیے۔۔۔۔

ارے عیاشی ہے۔۔۔ عیاشی۔۔۔

تم دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہو۔۔۔ تمہیں تو ہر وقت اپنی خوش قسمتی کے گیت گانے چاہئیں۔

اور تم مرنا چاہتی ہو۔۔۔

ہش۔۔۔۔ پاگل عورت

لو! تازہ پھلوں کا جوس پیو۔ یہ جوس تمہارے بدن میں زندگی کی نئی روح پھونک دے گا۔

تم جانتی ہو میں تمہیں کیوں زندہ رکھنا چاہتا ہوں؟

کیونکہ تم ہو بڑے کام کی چیز

میں نے اپنی زندگی کے فریم میں تم جیسی عورت کو ہی فٹ کرنے کا خواب دیکھا تھا۔۔ڈری۔
ڈری۔۔ سہمی سہمی۔۔۔۔ بیوقوف سی عورت۔۔۔!
شفاف پانی کی طرح۔۔۔۔جس روپ میں ڈھالو، ڈھل جائے۔
پھول کی طرح۔۔۔۔شاخ سے لٹکتی، مٹکتی، جھولتی رہے اور کانٹوں کے ہالے میں مسکراتی رہے۔
لونڈی کی طرح۔۔۔۔انداز زندگی کو سمجھے۔
سمندر کی طرح۔۔۔۔خاموش رہے
بادل کی طرح۔۔۔۔گھر کے تپتے آنگن کو اپنے آنچل سے ڈھک لے
برکھا کی طرح۔۔۔۔بنجر گھر کو سیراب کر دے
پرندوں کی طرح۔۔۔۔چہکتی رہے
حیوانوں کی طرح۔۔۔۔مطمئن اور جوانوں کی طرح تنومند۔۔
خوشبو کی طرح۔۔۔۔مہکتا ہوا بدن ہو تو
لہو کی طرح۔۔۔۔رگ و پے میں سرایت کرتی ہوئی جوانی اور۔۔۔
فرشتوں کی طرح۔۔۔۔سر تسلیم خم
ان سب خوبیوں کے ساتھ میں تمہیں کیسے مرنے دوں۔۔۔۔
زندگی کا امرت گھونٹ گھونٹ کر کے اپنے حلق سے اتار دو، اور جیو !
اور اگر تم واقعی مرنا چاہتی ہو۔۔۔۔تو مر جاؤ
میں ایک مکمل مرد ہوں۔۔۔ادھورا نہیں، جو تمہاری رفاقت کے بغیر جی نہ سکوں
ارے، اس محل میں تم جیسی ہزاروں عورتیں سجنے کے لیے تیار ہوں گی۔
تو نہیں اور سہی۔۔۔۔اور نہیں اور سہی۔

نعیم فاطمہ علوی

ادبی و تحقیقی مجلہ سہ ماہی الاقرباء کے دس سال

گذشتہ دس برسوں سے اسلام آباد سے شائع ہونے والا اردو ادب کا تحقیقی و تخلیقی مجلہ " سہ ماہی الاقرباء" جو آج بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے سب سے پہلے خبرنامے کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ یہ ادبی سلسلہ بڑھا اور پھر بڑھتا ہی چلا گیا چنانچہ جنوری ۲۰۰۱ء میں یہ مجلہ تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب بن کر عالمی افق پر طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اندرون و بیرون ملک جامعات اور اردو ادب کے طلباء و محققین کی ضرورت بن گیا۔ گذشتہ کئی برسوں سے یہ مجلہ ہارورڈ یونیورسٹی کے کورس پیکس میں شامل ہے جب کہ استنبول یونیورسٹی (ترکی) اوساکا یونیورسٹی (جاپان) اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا) کے سفارش یافتہ مطالعات کا حصہ ہے۔ واشنگٹن (امریکہ) سے شائع ہونے والی ڈائرکٹری "الریچ" کے ڈیٹا بیس میں پاکستان سے سہ ماہی "الاقرباء" کو ان جرائد و رسائل کے ساتھ شریک ہونے کا اعزاز حاصل ہے جو عالمی سطح کی تحقیق کے لیے مستند خیال کیے جاتے ہیں۔ پاکستان اور بیرون ملک کی معروف لائبریریوں میں اس مجلّے کی طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جن میں دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ

کتب "لائبریری آف کانگریس" بھی شامل ہے۔ جب کہ "الاقرباء" کی ویب سائٹ (www.alaqraba.com) سے دنیا بھر کے اہل علم اور ادب کے طلباء استفادہ کر رہے ہیں جس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ "الاقرباء" کے تمام مندرجات نظم و نثر مستند غیر مطبوعہ مواد پر مشتمل ہوتے ہیں۔
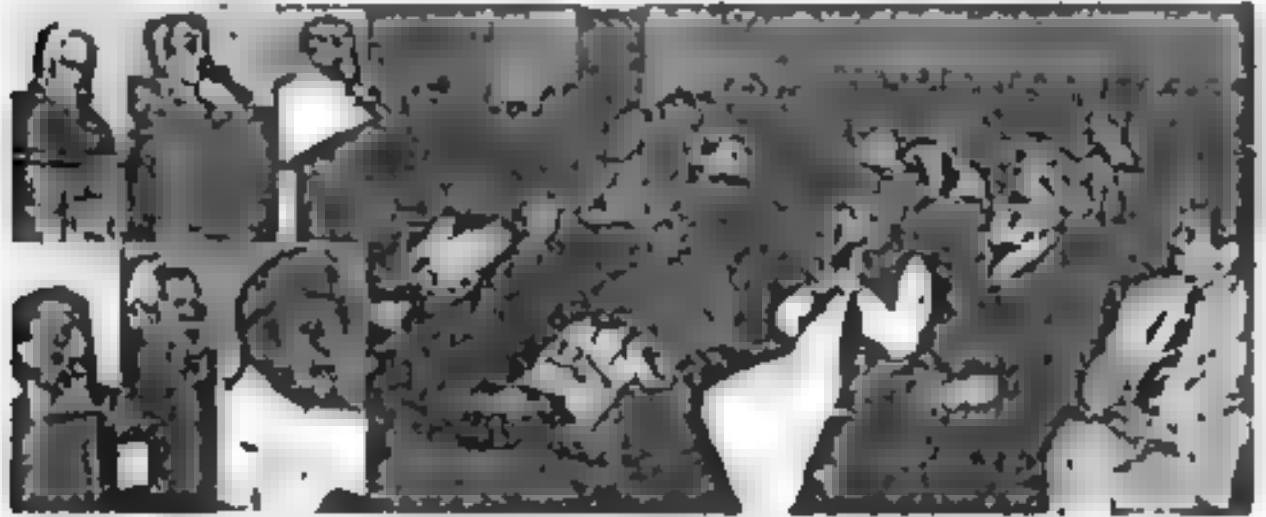
سامعین اور مقررین کا ایک منظر

"الاقرباء" کی مجلس ادارت کے صدر نشیں سید منصور عاقل ہیں ان کے رفقاء میں محترمہ شہلا احمد، سید ناصر الدین اور راقم الحروف شامل ہیں۔ اندرون و بیرون ملک مجالس مشاورت میں جو نامور سکالرز اور اہل قلم شریک ہیں ان میں پاکستان سے پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین سابق مسند نشین اقبالیات کیمبرج یونیورسٹی (برطانیہ) پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران صدر شعبہ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، معروف مصنف، محقق اور نقاد ڈاکٹر عالیہ امام اور شیر اشتیاق کی سید محمد حسن زیدی کے علاوہ بیرون ملک سے پروفیسر ڈاکٹر علی آسانی صدر شعبہ انڈو مسلم اینڈ اسلامک کلچر ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار صدر نشیں اردو زبان و ادب۔ استنبول یونیورسٹی (ترکی) پروفیسر ڈاکٹر سو یمانے یاسر شعبہ اردو اوساکا یونیورسٹی جاپان اور پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ انڈیا ہیں۔ جب کہ بیرسٹر سلیم قریشی (لندن) اور پروفیسر محمد اویس جعفری (واشنگٹن سٹیٹ امریکہ) بیرون ملک "الاقرباء" کے خصوصی رابطہ کار ہیں۔

گذشتہ برسوں کی طرح علمی و ادبی اور تہذیبی و ثقافتی تقریبات کے سلسلے میں اس مرتبہ جس

خصوصی محفل کا اہتمام کیا گیا اس کا موضوع ''سہ ماہی الاقرباء کے دس سال'' تھا۔ یہ محفل سرسید میموریل ہال اسلام آباد میں منعقد کی گئی جس میں اسلام آباد اور راولپنڈی کے مشاہیر علم و ادب نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ صدارت معروف سکالر اور محقق ڈاکٹر ایس۔ زمان نے فرمائی جو ہارورڈ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل (پی۔ ایچ۔ ڈی) اور متعدد پاکستانی جامعات کے وائس چانسلر نیز اسلامی نظریاتی کونسل کے چیرمین رہ چکے ہیں جب کہ مہمان خصوصی رئیس الجامعہ رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اور اسلامی فکر و نظر کے معروف سکالر پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد اور سرسید میموریل سوسائٹی کے صدر نشیں بریگیڈئر اقبال ایم شفیع تھے پاکستان کے معروف قانون دان وصحافی حبیب الوہاب الخیری اور پروفیسر ڈاکٹر معز الدین نے بطور مہمانان اعزاز شرکت فرمائی۔ سامعین اور مقررین کے خصوصی انہماک نے اس محفل کو یادگار بنا دیا۔ ہر شخص نے انتہائی توجہ اور دلجمعی سے اس تقریب میں حصہ لیا۔ محسوس ہوتا تھا۔ کہ پوٹھوہار کے دانشور بھی تہذیبی اور زبان و ادب کے معاملے میں کتنے سنجیدہ ہیں اور وہ اپنے عظیم ورثے کو اگلی نسل تک پہنچانے کے لیے کس حد تک ذوق و شوق رکھتے ہیں۔

آغاز ہی میں سید منصور عاقل کو میزبان صدر کی حیثیت سے ناظم محفل حسن زیدی نے دعوت کلام دی۔ انہوں نے مضبوط، مدلل، علم و آگہی اور فکر و دانش سے بھرپور کلمات اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں ادا کیے۔ یہ مخصوص دھیما لہجہ محفل دوستاں میں جس طرح ہنستا مسکراتا اور قہقہے لگاتا ہوا دکھائی دیتا ہے سہ ماہی الاقرباء کی ترتیب و تدوین اور اسے سجانے سنوارنے اور معیار پر تولنے اور پرکھنے میں انتہائی سنجیدہ اور سخت گیر بھی ہے۔ انہوں نے فرمایا ''ہمیں ادب و ثقافت اور علم و آگہی کے ان گوشوں کو جن سے نئی نسل آگاہ نہیں اجاگر کرنا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں غیر ملکی زبان و ادب کے تراجم زیادہ نہیں۔ حکومتی اداروں کو اس معاملے میں اہم کردار ادا کرنا چاہیئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا ادب دوسری زبانوں میں منتقل ہو اور دوسری زبانوں کا ادب ہماری زبان میں۔ اس سے نئے نئے افق واضح ہو سکے۔'' انہوں نے مزید فرمایا کہ اس میگزین کا ایک ایک

لفظ غیر مطبوعہ ہوتا ہے۔ ہاں البتہ فیض احمد فیض کی ایک نظم جو انہوں نے ۱۹۲۷ء میں جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی زبان وادب میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے علامہ اقبال کی شان میں کہی تھی وہ کالج میگزین "راوی" میں چھپی تھی مگر فیض صاحب کے کسی مجموعے میں نہیں۔ اسے حاشیے کے ساتھ الاقرباء میں شائع کیا گیا۔

اس کے بعد پروفیسر اقبال بگل کو دعوت دی گئی کہ وہ سہ ماہی الاقرباء کے دہ سالہ ادبی کردار پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ پروفیسر صاحب کا تبصرہ ان کی گہری تنقیدی نظر کا غماز تھا۔ جملوں کی گھن گرج، لفظوں کی گونج اور مطالعے کے تحقیقی اور تنقیدی زاویوں نے سامعین کو بہت متاثر کیا۔ انہوں نے فرمایا یہ مجلہ کلاسیکی ادبی رجحان کا علمبردار ہے تحریر کی شائستگی اور تحقیق کا اعلیٰ معیار۔ شخصی خاکے۔ طبع زاد کہانیاں، سائنسی مضامین، نقد ونظر اور شاعری میں فارسی تراکیب۔ وطن سے محبت کے تمام پیمانوں نے ایک نیا باب رقم کیا ہے۔ نعت کے حوالے سے عزت واحترام کے سارے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ اس کے اداریوں نے صحافت کی دنیا میں جہاں عشق کے آفتاب و ماہتاب روشن کر دیے ہیں۔ انہوں نے سہ ماہی الاقرباء کی تمام اصناف کو ہیروں سے لدے جہاز سے تشبیہ دی۔ غیر مطبوعہ تحریریں چھاپنے کے بارے میں انہوں نے فرمایا گویا یہ بھی لوگوں کو بانجھ پن سے نکال کر تازہ تخلیقات کی طرف مائل کرنے کی کوشش ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ منصور عاقل صاحب ہمیں فراموش کردہ اقدار سے متعارف کروا رہے ہیں۔ گویا وہ نئی نسلوں کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں۔

اس کے بعد عائشہ مسعود صاحبہ کو دعوت دی گئی۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں الاقرباء کے تہذیبی پہلو کو اجاگر کیا اور یوں گویا ہوئیں۔ "میں نے جب اس ہال میں قدم رکھا تو میں منصور عاقل صاحب کو شکلاً نہیں جانتی تھی۔ میں نے سوچا کوئی آئے گا اور مجھے منصور عاقل صاحب سے متعارف کروائے گا مگر اچانک میری نظر سامعین میں ایسے شخص پر پڑی جس کا سراپا، وضع قطع نسے کے لحاظ سے پاکستانیت کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا تو میں نے سوچا یہی منصور عاقل صاحب ہو نگے۔"

انہوں نے مزید فرمایا کہ سہ ماہی الاقرباء جس تہذیب کا عکاس ہے ہمارے قائد ایسا ہی پاکستان چاہتے تھے۔

ڈاکٹر معز الدین اپنی بیماری اور نقاہت کی وجہ سے بہ نفس نفیس تقریر تو نہ کر سکے البتہ انہوں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار انتہائی محبت اور خلوص سے لکھ کر کیا جسے حسن زیدی صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ وہاب الخیری صاحب کا تعارف خود منصور عاقل صاحب نے مائیک پر آ کر کروایا جس پر خیری صاحب نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں منصور عاقل صاحب نے اپنی محبت میں باندھ لیا ہے چنانچہ مجھے اب ادب کی طرف مراجعت کرنا ہی پڑے گی۔ بریگیڈیر شفیع صاحب نے فرمایا کہ میں اکثر منصور عاقل صاحب سے پوچھتا ہوں کہ منصور اور عاقل یکجا کیسے ہو گئے جس پر منصور عاقل صاحب نے برجستہ علامہ اقبال کا فارسی کا یہ شعر پڑھا:

در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست   با چنیں ذوقِ جنوں پاسِ گریباں داشتم

بریگیڈیر صاحب نے فرمایا کہ ادب برائے زندگی سے کسی حال میں صرف نظر نہیں کیا جانا چاہئے اور حالی کی مثال دی کہ جب مسدس لکھی تو شاعری کو زندگی آمیز اقدار سے روشناس کرایا۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد نے اپنی انتہائی پُر مغز تقریر میں بہت سی اہم باتیں کیں انہوں نے فرمایا کہ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے انتہائی باوقار ماحول میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اس دور میں ہماری ادبی روایات کو آگے بڑھانے میں الاقرباء کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے کہا اردو زبان کے حوالے سے جس لاتعلقی کا اظہار کیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے یہ ایک قومی المیہ ہے۔ ہماری وہ اقدار جو ہمارے خون میں بستی ہیں وہ ہمارے ہی لوگوں کے لئے اجنبی ہو گئی ہیں۔ انہوں نے مزید فرمایا "ادب، تحقیق اور ابلاغ کا بہت قریبی رشتہ ہے۔ ادب اور زبان و بیان کی خوبی، استعاروں، تشبیہوں اور مرصع تحریروں کا نام نہیں ہمارا انداز بیان سہل ہونا چاہئے تا کہ ہم ادبی وعلمی ورثہ اگلی نسل تک پہنچا سکیں نئی نسل عملاً تحقیق سے نا واقف ہے ہمیں چاہیے ہم اسے خلاصے کی شکل میں نوجوانوں کو پڑھائیں۔ ورکشاپ کروائیں۔ اس کے علاوہ ادب میں

دینی تصورات کو جذب اور یکجا کریں۔ مذہبی یا غیر مذہبی ادب کی تقسیم نہیں ہونی چاہیئے۔ فیض کا ظہور اقبال اور غالب کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔" انہوں نے مزید کہا ہمیں اصل اقدار حیات اسلام نے دی ہیں۔ ہمیں فکری گمراہی سے نکلنا پڑے گا اسلام کسی مخصوص علاقے کی پیداوار نہیں۔

صدر محفل ڈاکٹر زمان نے سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا مہذب اور شائستہ ہونا، ادب اور صحافت کے اندر ہی موجود ہے۔ انہوں نے لاقرباء کے بارے میں فرمایا کہ منصور عاقل صاحب نے اسلامی ادب کے مفہوم کو بڑی سخت گیری کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ اس مجلّے کی ہر صنف میں انفرادیت ہے جو واقعتاً حیرت انگیز بات ہے۔ تمام اصناف میں جدت اور ندرت کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھنا بڑی بات ہے۔ انہوں نے کہا ایڈیٹر کا کام ہے کہ کوئی بھی نوجوان جو شعر یا افسانہ لکھتا ہے اس پر وقت صرف کرے یہ نہ ہو کہ املا غلط ہو تراکیب کا صحیح استعمال نہ کیا گیا ہو۔ لاقرباء اس لحاظ سے ایسی مثال ہے جس کی پیروی کی جانی چاہیئے۔ انہوں نے اس خواہش کے ساتھ اجازت چاہی کہ کاش ہماری زبان اس قابل ہو جائے کہ اس میں نئے سے نئے مضامین اور علوم شامل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خوبصورت اور باوقار تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

قلمی معاونین سے التماس

ہماری بہترین کوشش کے باوجود 'الاقرباء' کی سطور میں حرفی و لفظی اغلاط کہیں کہیں رہ جاتی ہیں، جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ تاہم ان اغلاط کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہاتھ سے لکھے مسودات پڑھنے میں اکثر دشواری پیش آتی ہے۔ ہم از حد ممنون ہوں گے اگر ہمارے فاضل قلمی معاونین اپنے مسودات ٹائپ شدہ صورت میں ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

پروفیسر اقبال گل

الاقرباء کا دبستانِ ادب

تحریر کی شائستگی جس کا ساری مہذب دنیا تقاضا کرتی ہے، تحقیق کا استعجاب جو محقق کی کارگزاری کا ضامن ہوتا ہے کلاسیکی ادبی رجحانات کے روشن راستے، تخلیق کی حیرت انگیز تاثیر، خوشبو، اور شادابی جو دلوں کو گرماتی بھی ہے اور آسودہ بھی کرتی ہے۔ یہ سب ''الاقربا'' کے دبستانِ ادب کے نصاب میں شامل ہیں۔

اپنے نصاب کی حدود میں رہتے ہوئے اس دبستان کا یہ مجلہ اعلیٰ معیار کے مضامین، شخصی خاکے، ادیبوں اور شاعروں کے گوشے، افسانے، طنز و مزاح، طبع زاد کہانیاں، ''وے صورتاں الٰہی کس ولیس بستیاں ہیں'': ساکنانِ شہرِ خموشاں کے لیے گوشۂ رفتگاں، مذہب سے وابستہ اقدار: مثلاً عفو، نیکی، خیرات، خیر خواہی، استغنا، بُردباری، صبر و شکر، اور عاجزی جیسی روشن نگارشات شائع کرتا ہے جو گنج گراں مایہ سے کم نہیں۔ یہی نگارشات ہیں جو اپنے تخلیق کاروں کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار تک لے جاتی ہے۔

الاقرباء میں سائنس اور سائنسی ایجادات کے بارے میں سنجیدہ مضامین بھی اشاعت پذیر ہوتے ہیں خدائے بزرگ و برتر جو اس کائنات کا مالک ہے اُس کی حمد اور اُس کے محبوب کی نعت کی برکت نے اس مجلے کے لیے دنیا بھر میں عزت و احترام کے سارے دروازے کھول رکھے ہیں۔

شاعری کے باب میں بھی اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں غیر شائع شدہ غزلیں اور نظمیں شامل کی جاتی ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے قاری کو ایسی جذباتی مسرت بخش دیتی ہیں جو ہیروں سے لدے ہوئے جہاز سے کم نہیں ہوتی۔ ''الاقرباء'' کا ایک باب نقد و نظر ہے جس میں ادبی تحریروں پر معروضی تبصرے اور تقریظیں لکھی جاتی ہیں تحقیق اور تخلیق کاروں کو مزید لکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے اُن کی محنت اور ادب سے محبت کا اعتراف کر کے تعمیر ادب کی منڈیروں کو

اَخلاقی چراغوں سے روشن کیا جاتا ہے۔

اس کا ہر صفحہ ارادی اور غیر ارادی تعصب کے داغوں سے پاک ہے یہاں تک کہ ہندی اور سنسکرت جو ہماری تہذیب وثقافت کی ہم قدم اور ہم راز رہی ہیں۔ ان کا عکس اور وجود اردو کی تحریروں میں اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ جہاں مقامی زبانوں کے الفاظ اور تراکیب عبارتوں کی زینت بنتے نظر آتے ہیں وہاں بالخصوص اردو شاعری میں فارسی الفاظ تراکیب اور تلمیحات اس کا سرمایہ افتخار ہے۔

اس مجلّے کے رجحانات مترقب زاویہ نظر رکھتے ہیں، یعنی وطن سے محبت، ارادوں کا استقلال خودداری اور سپردگی، حوصلہ مندی اور دردمندی کے ساتھ "تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست" کے ناقۂ سیار کے بجتے ہوئے زنگ دور تک سنائی دیتے ہیں۔

ادب کی نئی اصناف کے بارے میں الاقرباء ایک مخصوص اور محتاط رویہ رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مجلّہ اردو زبان کی لسانی وسعت وعظمت کا علم بردار ہے جو نظم اور نثر کے ہر موضوع کو اپنی گرفت میں لینے پر قادر ہے مزید یہ کہ ایسی، صنافِ ادب جیسے نثری شاعری اور غیر ملکی اصناف، جو ہماری نہیں بلکہ غیر ملکی تہذیب وثقافت کو فروغ دیتی ہیں اُن سے الاقرباء صرفِ نظر کا میلان رکھتا ہے۔

گذشتہ دس (۱۰) برس کے چالیس (۴۰) شماروں سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ الاقرباء نئی نسل کے ادبی، ثقافتی، تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی رویّوں کو سنوارنے، نکھارنے اور وسعتِ مطالعہ کی ترغیب دینے میں ہراوّل دستے کا فریضہ انجام دیتا رہا ہے۔

آپ اس کے اداریے پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ان تحریروں نے صحافت کی تاریخ میں ایک قابلِ رشک مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس لیے کہ ان اداریوں میں معاصر موضوعات مثلاً ادب، تعلیم، ثقافت، معاشرت اور فکر ونظر کے زاویوں کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے اس اعتبار سے یہ رسالہ ایک ایسا "ساغرِ جم" ہے جس میں گذشتہ دس برس کی ادبی تاریخ اور معاشرتی رویّوں کا عکس موجود ہے۔

الاقربا کا ایک اہم موضوع 'اقبالیات' ہے گزرے ایک سو (۱۴۰) مہینوں میں شائع شدہ شماروں میں ایک بھی ایسا شمارہ نہیں جس میں اس موضوع پر نامور اہلِ قلم خواتین و حضرات کی نگارشات موجود نہ ہوں۔

یہ رسالہ مزاجاً ادب کی کلاسیکی فضا میں سانس لیتا ہے۔ کاملیت اور اپنے مقرر کردہ معیار کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں مسلسل کوشاں رہنا اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ اس کی بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ اس کو اندرون اور بیرونِ ملک سے اپنے عہد کے مشہور و معروف تخلیق کاروں، شاعروں اور اہلِ قلم کا برابر تعاون حاصل ہے۔

پاکستان میں اس کی مجلسِ مشاورت میں ڈاکٹر محمد معز الدین، ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، ڈاکٹر عالیہ امام، اور سید محمد حسن زیدی شامل ہیں۔ بیرونِ ملک سے ڈاکٹر علی آسانی (ہارورڈ۔ امریکہ)۔ ڈاکٹر خلیل طوقار (ترکی) ڈاکٹر سویمانے یاسر (جاپان) اور ڈاکٹر محمد زاہد (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اس کے دست و بازو ہیں۔

کسی بھی معتبر ادبی رسالے کی ادارت بڑی ذمے داری کا کام ہے 'الاقربا' کی ادارت کے ارکان میں محترمہ شہلا احمد (مدیر مسئول)، سید ناصر الدین (مدیر منتظم) اور محترمہ نعیم فاطمہ علوی مدیر معاون اپنے فرائض کی انجام ہی میں اُس تاریخی عمارت کی طرح ہیں جس کی دیواروں کے سائے میں تھکے ہوئے مسافر کچھ دیر ستانے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں، لیکن معمار کا نام وقت کے پردوں کے پیچھے چھپا رہتا ہے

آپ ذرا چشمِ تصور سے دیکھیے مصر کا بازار لگا ہوا ہے۔ کنعان کا مسافر فروخت ہونے کے لیے موجود ہے۔ امیر و کبیر خریداروں کے گروہ میں ایک زنِ پیر جس کی کل پونجی دھاگے کی ایک انٹی ہے، یوسف کو خریدنے آئی ہے اُس سے پوچھا گیا: محترم خاتون تیرے پاس غربت کے سوا کیا ہے جو تو اتنا قیمتی بردہ خریدنے آئی ہے بڑھیا کا جواب سنیے: مجھے معلوم ہے کہ خریداری میری اوقات سے باہر ہے لیکن میرا نام خریداروں میں لکھا جائے یہی میری آرزو ہے امید ہے ایک زمانہ ایسا بھی

آئیگا جب "کورکان پختہ سال" فخریہ کہا کریں گے کہ ہمارے آباؤ اجداد الاقرباء کے قاری ہوا کرتے تھے۔

اس کے نشانِ امتیاز میں تحقیقی اور تخلیقی نگارشات کے علاوہ ایسا طبع زاد مواد موجود ہوتا ہے۔ جو پہلی بار اس کے صفحات کی زینت بنتا ہے یہی چیز اسے منفرد اور باوقار بناتی ہے۔ اس مجلّے نے اپنے منازل طے کرنے میں جس ثابت قدمی اور ارادی پختگی کا ثبوت دیا ہے اُسے دہرانے یا بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ "مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

لیکن آرزوئے کمال کی تشنگی کا کیا کیا جائے۔ اس کے صدر نشین جناب سید منصور عاقل صاحب دس برس کے بعد بھی یہی کہہ رہے ہیں:

ہر اوج پر بلند مگر ہے نگہ ہنوز ـــــ حاصل کو میں نے پھر غم حاصل بنا دیا

ایک اور نئی بات جو اس میں شامل ہے وہ "تاریخ گوئی" ہے۔ سید انتخاب علی کمال کا کمال ہے کہ وہ معروف تخلیق کاروں کی "تاریخ ہائے وفات" ترتیب دینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اُن کے بنائے ہوئے تاریخی زائچوں اور فن تاریخ گوئی کی مثال کسی دوسرے رسالے میں نہیں ملتی اُن کے لیے یہ کہنا کس قدر مناسب ہے کہ "کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی"

اس رسالے کا ایک باب خطوط پر مشتمل ہے صدر نشین اور مدیر کے نام اندرون اور بیرون ملک سے اہل دانش و فراست کے کے خطوط اس کی نگارشات کے بارے میں آراء اور مشورے اس کے فکری آسمان پر تاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ 'الاقرباء' کے دبستان ادب سے پاکستان کے علاوہ امریکہ، کینیڈا، انگلستان، ترکی، امریکہ، ہندوستان، جاپان اور آسٹریلیا کے صفِ اول کے اہل قلم وابستہ ہیں۔ ان سب کی مسلسل معاونت اور 'ادبی ہم سفری' کے تجربات نے اس رسالے کے ادبی افق پر کئی مہر و مہتاب روشن کر دیے ہیں۔ محترمہ نعیم فاطمہ علوی نے اپنے مقالے بہ عنوان: 'الاقرباء' کے ادبی تشخص پر ایک نظر میں اہل قلم کے اسمائے گرامی اور اہم ترین مقالات جو اب تک اس میں شائع ہو چکے ہیں وضاحت کر دی ہے۔ اداریوں کا تذکرہ ہو چکا ہے تاہم چند ایک نہایت

اہم نوعیت کے اداریوں کے عنوانات پیش خدمت ہیں: قومی ورثے کا تحفظ، ادب میں سرقہ و خیانت کے مسائل، مغرب میں اردو زبان کے امکانات، اہلِ قلم اور ذرائع ابلاغ، تعلیم اور قومی تشخص، ادب کا نوبل انعام، زبانوں کا بین الاقوامی سال، پاکستان میں اردو ادبی تحقیق کا مستقبل نظامِ تعلیم کے تہذیبی و ثقافتی مضمرات، رسم الخط کے مباحث، فکرِ اقبال کی معنویت وغیرہ۔ ''اقبال کا تصورِ پاکستان اور فرزندِ اقبال کے ارشادات'' قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

دنیا بھر سے جن اہلِ قلم کے خطوط الاقربا کے نام آتے ہیں ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ یہاں ان سب کا تذکرہ اور تفصیل مشکل ہے۔ تاہم یہ خطوط ایک طرف لکھنے والوں کی رفعتِ فکر کا پتہ دیتے ہیں دوسری طرف ادب کی اندھیری راتوں میں ''ماہِ نخشب'' سے روشنی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت کی جاتی ہے کہ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے مجلّے کے تمام شمارے انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ خطِ استوا اور خطِ سرطان تو کرۂ ارض سے لپٹے ہوئے فرضی خط ہیں مگر 'الاقربا' کے نام آنے والے مہر و محبت سے لبریز خطوط اس کی روح رواں ہیں۔

آخر میں میں اُن تمام دانش وروں کو سلام پیش کرتا ہوں جو اس صدی کے منتشر شب و روز کو یکجا کرنے کے لیے روز و شب کوشاں ہیں یہ عظیم لوگ آنے والی نسلوں کے لیے علم کے چراغوں کی کہکشاں کے خالق ہیں ان کے لیے محبت کے خزینے بھر رہے ہیں۔ اعلیٰ انسانی اقدار کی نشان دہی کرتے ہیں ادبی ذوق کی پرداخت کرتے ہیں۔ تحقیق کی لگن اور تخلیق کی آبرو سے روشناس کراتے ہیں زبان و بیان کی دلکشی، تہذیب و تمدن کی آب و تاب سے لطف اندوز ہونا اور وقتِ گزراں کے ساتھ ہم رکاب ہونے کا سلیقہ سکھاتے ہیں عہدِ حاضر اور مستقبل کے ان ادا شناسوں کو دوبارہ سلام پیش کر کے اجازت چاہتا ہوں۔

پرتو روہیلہ

سہ ماہی "الاقرباء" کے عشرۂ اشاعت کی تکمیل پر تقریب سے خطاب

جناب صدر گرامی۔ مسند نشینانِ مکرم۔ مہمانانِ خصوصی و سامعین ارجمند

ابھی کل ہی کی بات ہے کہ الاقرباء کا پہلا شمارہ پڑھنے کو ملا تھا اس کو کھولنے اور پڑھنے سے پیشتر ہی اس نام کی گونج بھی اس لفظ کے عصری تلازمات کے ساتھ ذہن پر اثر انداز ہوئی تھی۔ اور پھر کھولنے اور پڑھنے کے بعد تو رفقائے قدیم و جدید سب ہی سے ملاقات ہوتی گئی کہ سارے کے سارے مجلس ادارت و مشاورت میں نہیں تو اس مجلّے کے معاونین میں کسی نہ کسی طور ضرور شامل تھے۔ بھی اس مجلّے کی ابتداء ہی تھی کہ ادارے کی طرف سے اس نام کی صیانت و وجاہت پر ایک مسکت تحریر پڑھنے کو ملی جس نے سارے شیطانی وسوسوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہ لفظ صفت یعنی شیطانی میں نے اس وجہ سے استعمال کیا کہ اگر حافظہ ساتھ دے رہا ہے تو ان جوازات میں کہ اس نام کے حق میں گنوائے گئے تھے کچھ حدیثوں سے بھی مدد لی گئی تھی۔ اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ جب دنیاوی کاوش کے ساتھ دینی برکات بھی شامل ہوں تو ترقی کے مدارج کس طرح طے ہوئے ہونگے۔ غرض اس مجلّے کی ترقی کے مدارج کے ضمن میں اگر بات کی جائے تو وہ زبان و بیان کے مسلمہ اور سکہ بند سانچوں کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتی۔ سو میں کہ اپنے آپ کو بھی بزعمِ خویش زبان کی درستی میں بہت متشدد تصور کرتا اور برادر گرامی منصور عاقل صاحب کو اس جیش پاسبانانِ زبان کا سپہ سالار تصور کرتا ہوں اور بعد معذرت عرض کرونگا کہ مجھے اس قدر تحریف کی اجازت دیں کہ یہ کہہ سکوں کہ یہ ترقی دن دس گنی اور رات بیس گنی تھی۔ جبھی تو ہم آج اس کی دسویں سالگرہ منا رہے ہیں اور واقعی ایسا لگتا ہے یہ دس سال ایک سال میں گزر گئے۔

میں پچھلے دس سال میں زیادہ تر طلسمات غالب کے شیش محل میں محصور رہا جو باقی وقت تھا وہ خرافات دنیا کی نذر ہو گیا۔ چنانچہ بزم "الاقرباء" میں مری معاونت میری خواہش کے باوجود

یلغار" جیسے انتہائی پیچیدہ، اہم اور قومی و بین الاقوامی طور پر انتہائی دور بین مقاصد کے حامل موضوع پر ہے۔ یہ تمام اداریے دراصل فی نفسہٖ ایسے مقالات ہیں جو انتہائی تحقیق، ژرف نگاری اور دقتِ نظر کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ سو تازہ شمارے کا محولہ بالا اداریہ بھی اسی قبیل میں شامل ہے اور سارے خصائص ایک تحقیق کردہ مقالے کے رکھتا ہے۔ حسب سابق اس میں بھی صدر نشین گرامی کی قادر الکلامی کے ساتھ ان کے علمی پس منظر کی وسعت ان کے تاریخی و تہذیبی شعور اور قومی و بین الاقوامی سیاست سے آگہی کی عکاسی ہوتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے عصری ادبی مجلوں کے اداریوں میں تاریخی، سیاسی اور دینی آگہی اس پائے کی ہو جیسی اس نئے شمارے کے اداریے میں ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں میں اس اداریے کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"جسے بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے ۹/۱۱ کے سانحے کا نام دیا وہ نقطۂ آغاز تھا ایک ایسے عالمی خلفشار کا جس نے تہذیبی، مذہبی، سیاسی، فکری و نظریاتی محرکات کو بے رحم عسکریت کے سپرد کر دیا۔ قرائن و آثار ثابت کر چکے ہیں کہ پس منظر تہذیبی تصادم اور تعصب و منافرت کے متعفن رویوں سے بری طرح آلودہ ہے۔ ایوبی فتوحات اور صلیبی عہد نے جس سفاک انتقامی جذبے کو جنم دیا تھا وہ ۹/۱۱ کے بعد آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا ہے اور مہلک ترین اسلحہ سے لیس مغرب، بزعم خویش ارفع و اعلیٰ طاقتی مرکز بن جانے کے نشے میں مشرق، بالخصوص ایک ایسے نظریہ حیات اور دین امن کے خلاف صف آرا ہو چکا ہے جس کی ابدی حقانیت اور عالمگیر صداقت سے خائف بھی ہے اور اس پر غضب ناک بھی۔"

اور اب آپ لوگوں سے رخصت ہونے سے پیشتر میں اس موقر مجلے کے بانیوں کے ساتھ اس کے صدر نشین جناب سید منصور عاقل صاحب کو مجلس ادارت کے تمام اراکین مکرم اور قارئین و معاونین بشمول آج کی بزم کے سامعین کے اس کی دسویں سال گرہ پر انتہائے خلوص دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس بزم یاراں میں شرکت کو اپنے لیے بھی ایک سعادت تصور کرتا ہوں۔ "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم"

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا

نسائیات (FEMINISM)

عالمی ادبیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر عہد میں مفکرین نے وجود زن کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ رنگ خوشبو اور حسن و خوبی سے تمام استعارے وجود زن سے منسوب چلے آ رہے ہیں۔ اس طرح اسے عالمی تصور کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ علامہ اقبال نے خواتین کے کردار کے حوالے سے لکھا ہے

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درمکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں
(۱)

خواتین کے لب و لہجہ میں تخلیق ادب کی روایت خاصی قدیم ہے۔ ہر زبان کے ادب میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ نوخیز بچے کی پہلی تربیت اور اخلاقیات کا گہوارہ آغوش مادر ہی ہوتی ہے۔ اچھی مائیں قوم کو معیار اور وقار کی رفعت میں ہمدوش ثریا کر دیتی ہیں۔ انھی کے دم سے امیدوں کی فصل ہمیشہ شاداب رہتی ہے۔ یہ دانہ دانہ جمع کر کے خرمن بنانے پر قادر ہیں تا کہ آنے والی نسلیں فروغ گلشن اور صوت ہزار کا موسم دیکھ سکیں۔ صبر و رضا، قناعت اور استغنا ان کا امتیازی وصف ہے۔ لوئیس بوگان نے کہا ہے۔

Women have no wilderness in them
They are provident instead
Content in the tight hot cell of their hearts
to eat dusty bread (۲)

فنون لطیفہ اور ادب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں خواتین نے اپنی کامرانیوں کا پرچم بلند نہ کیا ہو۔ آج تو زندگی کے ہر شعبے میں خواتین نے اپنی بے پناہ استعداد کار کا لوہا منوایا ہے۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خواتین نے فنون لطیفہ اور معاشرے میں ارتباط کے حوالے سے ایک پل کا کردار ادا کیا۔ فرد کی بے چہرگی اور عدم شناخت نے آج گمبھیر صورت اختیار کر لی ہے۔ ان اعصاب شکن حالات میں بھی خواتین نے اس جانب متوجہ کیا کہ فرد کو اپنی حقیقت سے آشنا ہونا چاہیے۔ مسلسل شکست دل کے باعث مظلوم طبقہ محرومیوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ ظالم وسفاک موذی و مکار استحصالی عناصر کے مکر کی چالوں کے باعث رُتیں بے ثمر، کلیاں شرر، زندگیاں پُر خطر اور آہیں بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں۔ خواتین نے ہر عہد میں جبر کی مزاحمت کی، ہر ظالم پر لعنت بھیجنا اپنا شعار بنایا اور انتہائی نا مساعد حالات میں بھی حریت ضمیر سے جینے کا راستہ اختیار کیا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارا معاشرہ بالعموم مردوں کی بالادستی کے تصور کو تسلیم کر چکا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں جب کہ خواتین کو اپنے وجود کے اثبات اور مسابقت کے لیے انتھک جدوجہد کرنا پڑے، خواتین کے لیے ترقی کے یکساں مواقع تخیل کی شادابی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ خواتین کی فکری کاوشیں سفاک ظلمتوں میں ستارہ سحر کے مانند ہیں۔ انھوں نے کٹھن حالات میں بھی حوصلے اور امید کا دامن تھام کر سوئے منزل رواں دواں رہنے کا جو عہد وفا استوار کیا اسی کو حدرج گرش لیل و نہار بھی قرار دیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شعبہ زندگی میں خواتین بھرپور اور اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ عالمی ادبیات مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ سماجی زندگی کے جملہ موضوعات پر خواتین کے اشہب قلم نے جو بے مثال جولانیاں دکھائی ہیں ان کے اعجاز سے طلوع صبح بہاراں کے امکانات روشن تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

نسائیات ایک ایسی مثبت سوچ، مدبرانہ تجزیہ اور دانشورانہ اسلوب کی جانب متوجہ کرتی ہے جس کے اہداف میں خواتین کے لیے معاشرے میں ترقی کے منصفانہ اور یکساں مواقع کی فراہمی کو یقینی بنانے کا واضح لائحہ عمل متعین کیا گیا ہو۔ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ خواتین کسی خوف و

ہراس کے بغیر کاروانِ ہستی کے تیز گام قافلے میں مردوں کے شانہ بشانہ اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ روشنی کے اس سفر میں انھیں استحصالی عناصر کے مکر کی چالوں سے خبردار کرتا حق و انصاف کی بالادستی حریت فکر، آزادیٔ اظہار اور معاشرے کو ہر قسم کے استحصال سے پاک کرنے پر اصرار کیا گیا۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ فکری کجی کے باعث نسائیات اور جنسیت کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے حالانکہ نسائیات اور جنسیت میں ایک واضح حد فاصل ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ نسائیات اپنے مقاصد کے اعتبار سے جنسیت کی ضد ہے۔ نسائیات کے امتیازی پہلو یہ ہیں کہ اس میں زندگی کی سماجی، ثقافتی، سیاسی، عمرانی اور ہر قسم کی تخلیقی اقدار و روایات کو صیقل کرنے اور انھیں مثبت انداز میں بروئے کار لانے کی راہ دکھائی جاتی ہے۔ اس میں خواتین کی صلاحیتوں کو نکھارنے کے فراواں مواقع کی جستجو پر توجہ مرکوز رہتی ہے۔ یورپ میں نسائیات کا غلغلہ پندرہویں صدی عیسوی میں اٹھا۔ اس میں مد و جزر کی کیفیت سامنے آتی رہی۔ یہ ٹھہرے پانی میں ایک پتھر کے مانند تھی اس کی دوسری لہر ۱۹۶۰ء میں اٹھی جب کہ تیسری لہر کے گرداب ۱۹۸۰ء میں دیکھے گئے۔ ان تمام حالات اور لہروں کا یہ موہوم مد و جزر اور جوار بھاٹا جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑ گیا اس کا لب لباب یہ ہے کہ خواتین کو اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں حریت ضمیر سے جینے کی آزادی ملنی چاہیے۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے اور ہر قسم کی عصبیت سے گلو خلاصی حاصل کر لی جائے تو یہ بات ایک مسلمہ صداقت کے طور پر سامنے آتی ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام نے خواتین کو جس عزت، تکریم اور بلند مقام سے نوازا اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ تبلیغ اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر خلافت راشدہ کے زمانے تک اسلامی معاشرے میں خواتین کے مقام اور کردار کا حقیقی انداز میں تعین کیا جا چکا تھا۔ اس عہد میں مسلم خواتین ہر شعبۂ زندگی میں فعال کردار ادا کر رہی تھیں۔ اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں خواتین کو یکساں مواقع اور منصفانہ ماحول میں زندگی بسر کرنے کی ضمانت دی۔ آج بھی اگر وہی جذبہ بیدار ہو جائے تو آگ بھی انداز گلستاں پیدا کر سکتی ہے۔

جدید دور میں نسائیات کے حوالے سے تنقیدی مباحث روز افزوں ہیں۔ آج خواتین تیشۂ

حرف سے فصیل جبر منہدم کرنے کی مقدور بھر سعی کرتی نظر آتی ہیں۔ ایسے تمام تار عنکبوت جو کہ خواتین کی خوشحالی اور ترقی کے افق کو گہنا رہے ہیں انھیں نیست و نابود کرنے کا عزم لیے خواتین اپنے ضمیر کی للکار سے جبر کے ایوانوں پر لرزہ طاری کر دینے کی صلاحیت سے متمتع ہیں۔ ان کا نصب العین یہ ہے کہ انسانیت کی توہین، تذلیل، تضحیک اور بے توقیری کرنے والے اجلاف وارزال اور سفہا کے کریہہ چہرے سے نقاب اٹھائی جائے اور ایسے ننگ انسانیت وحشیوں کے قبیح کردار سے اہل درد کو آگاہ کیا جائے۔ نسائیات نے تمام خفاش منش عناصر کو آئینہ دکھایا ہے اور زندگی کی حقیقی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔ تانیثیت کا دائرہ کار تاریخ، علم بشریات، عمرانیات، معاشیات، ادب، فلسفہ، جغرافیہ اور نفسیات جیسے اہم شعبوں تک پھیلا ہوا ہے۔ نسائیات میں تحلیل نفسی کو کلیدی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ نسائیات کے مطابق معاشرے میں مرد اور عورت کو برابری کی سطح پر مسائل زیست کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ یہ اپنے وجود کا خود اثبات کرتی ہے۔ نسائیات نے معاشرے میں بڑھتے ہوئے جنسی جنون اور ہیجان کی مسموم فضا کا قلع قمع کرنے اور اخلاقی بے راہ روی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے سلسلے میں جو کردار ادا کیا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کی اقدار عالیہ کے تحفظ اور درخشاں روایات کے قصر عالی شان کی بقا کی خاطر نسائیات نے ایک قابل عمل معیار وضع کیا جو کہ خواتین کو حوصلے اور اعتماد سے آگے بڑھنے کا ولولہ عطا کرتا ہے۔ اخلاقی اوصاف کے بیان میں بھی نسائیات نے گہری دلچسپی لی۔ قدرت کاملہ نے ان اوصاف حمیدہ سے خواتین کو نہایت فیاضی سے متمتع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قدرتی عنایات کا دل نشیں انداز میں بیان بھی اس کا امتیازی وصف ہے۔ ان فنی تجربات کے ذریعے جدید اور متنوع موضوعات سامنے آئے اور نئے امکانات تک رسائی کو یقینی بنانے کی مساعی کا سلسلہ چل نکلا۔

قدرت کے اس وسیع نظام میں جمود اور سکون بہت محال ہے۔ زندگی حرکت اور حرارت سے عبارت ہے۔ کسی بھی عہد میں یکسانیت کو پسند نہیں کیا گیا اس کا سبب یہ ہے کہ یکسانیت سے ایک

مشتبہ سی صورت حال کا گمان گزرتا ہے۔ اس عالم آب و گل میں سلسلۂ روز و شب ہی کچھ ایسا ہے
کہ مرد اور عورت کی مساوی حیثیت کے بارے میں بالعموم تحفظات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔
نسائیات نے اس اہم موضوع پر توجہ مرکوز کر کے بلاشبہ اہم خدمت انجام دی۔ اس پر مبنی
نظریے (Feminist Theory) نے خواتین کو مژدہ جاں فزا سنایا کہ قید حیات اور بند غم
سے دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ زندگی تو جوئے شیر، تیشہ اور سنگ گراں کا نام ہے۔ عزت
اور وقار کے ساتھ زندہ رہنا، زندگی کی حیات آفریں اقدار کو پروان چڑھانا خوب سے خوب تر کی
جستجو کرنا، ارتقا کی جانب گامزن رہنا کامرانی اور مسرت کی جستجو کرنا اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا،
حریت فکر اور آزادیٔ اظہار کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرنا فن کار کی انا کا بھرم برقرار رکھنا اور
اپنے تخلیقی وجود کا اثبات کرنا ان کا اہم ترین منصب ہے۔ نسائیات نے افراد، معاشرے، علوم اور
جنس کے حوالے سے ایک موزوں ارتباط کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ ممتاز نقاد ٹیری ایگلٹن
(Terry Eagleton) نے لکھا ہے۔

> " Feminist theory provided that precious link between academia and society as well as between problems of identity and those of political organization, which was in general harder and harder to come by in an increasingly conservative age." (3)

نسائیات کو ادبی حلقوں میں ایک نوعیت کی تنقید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ
خواتین جنھیں معاشرے میں ایک اہم مقام حاصل ہے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو نکھارا جائے اور
انھیں تخلیقی اظہار کے فراواں مواقع فراہم کیے جائیں۔ مغرب میں اسے ۱۹۷۰ء میں پذیرائی ملی۔
یورپی دانشوروں نے اس کی ترویج و اشاعت میں گہری دلچسپی لی۔ اس طرح رفتہ رفتہ لسانیات اور
ادبیات میں نسائیات کو ایک غالب اور عصری آگہی کے مظہر نظریے کے طور پر علمی اور ادبی حلقوں
نے بہت سراہا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد سے نسائیات پر مبنی تصورات کو وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہوئے اس

کی سماجی اہمیت پر زور دیا گیا۔ اس طرح ایک ایسا سماجی ڈھانچہ قائم کرنے کی صورت تلاش کی گئی جس میں خواتین کے لیے سازگار فضا میں کام کرنے کے بہترین مواقع دستیاب ہوں۔ نسائیات کی علم بردار خواتین نے ادب کے وسیلے سے زندگی کی رعنائیوں اور توانائیوں میں اضافہ کرنے کی راہ دکھائی۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ جذبات، تخیلات اور احساسات کو اس طرح الفاظ کے قالب میں ڈھالا جائے کہ اظہار کی پاکیزگی اور اسلوب کی ندرت کے معجز نما اثر سے خواتین کو قوت ارادی سے مالا مال کر دیا جائے اور اس طرح انسانیت کے وقار اور سربلندی کے اہداف تک رسائی کی صورت پیدا ہو سکے۔ اس عرصے میں نسائیات کی بازگشت پوری دنیا میں سنائی دینے لگی۔ خاص طور پر فرانس، برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں اس پر قابل قدر کام ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نسائیات کی شکل میں بولنے اور سننے والوں کے مشترکہ مفادات پر مبنی ایک ایسا ڈسکورس منصۂ شہود پر آیا جس نے خواتین کے منفرد اسلوب کا اعتراف کیا۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ نسائی جذبات میں انانیت نمایاں رہتی ہے مگر یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ان کے جذبات میں خلوص، ایثار، مروت، محبت اور شگفتگی کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ نسائیات نے انسانی وجود کی ایسی عطر بیزی اور عنبر فشانی کا سراغ لگایا جو کہ عطیہ خداوندی ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں تمام مظاہر فطرت کے گہرے مشاہدے سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ جس طرح فطرت ہر لحظہ لالے کی حنا بندی میں مصروف عمل ہے اسی طرح خواتین بھی اپنے روز و شب کا دانہ دانہ شمار کرتے وقت بے لوث محبت کو شعار بناتی ہیں۔ خواتین نے تخلیق ادب کے ساتھ جو بے تکلفی برتی ہے اس کی بدولت ادب میں زندگی کی حیات آفریں اقدار کو نمو ملی ہے موضوعات، مواد اسلوب، لہجہ، اور پیرایۂ اظہار کی ندرت اور انفرادیت نے ابلاغ کو یقینی بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ نسائیات کا اس امر پر اصرار رہا ہے کہ جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار اس خلوص اور دردمندی سے کیا جائے کہ ان کے دل پر گزرنے والی ہر بات برمحل، فی الفور اور بلاواسطہ انداز میں پیش کر دی جائے۔ اس زمانے کی نسائی مرقع نگاری کے نمونے سامنے آتے ہیں کہ قاری

چشم تصور سے تمام حالات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ تیسری دنیا کے پس ماندہ غریب اور وسائل سے محروم ممالک جہاں اب بد قسمتی سے جہالت نے بھی ایک مسلک کی صورت اختیار کر لی ہے نہ صرف خواتین بلکہ پوری نسانیت پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے۔ رہزنانِ اندر قریش کے مکر سے خواتین کے درپئے آزار رہتے ہیں۔ ان ہراساں شب و روز میں بھی خواتین نے اگر حوصلے اور امید کی شمع فروزاں رکھی ہے تو یہ بڑے دل گردے کی بات ہے۔ خواتین نے ادب، فنون لطیفہ اور زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کی ہاں میں ہاں ملانے اور ان کی کورانہ تقلیدی مہلک روش کو اپنانے کے بجائے اپنے لیے جو طرز فغاں ایجاد کی بالآخر وہی ان کی طرز ادا ٹھہری۔ جولیا کرسٹیوا (Julia Kristeva) نے اس بارے میں لکھا ہے۔

"Truly feminist innovation in all fields requires an understanding of the relation between maternity and feminine creation" (4)

خواتین نے مردوں کی بالادستی اور غلبے کے ماحول میں بھی حریت فکر کی شمع فروزاں رکھی اور جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے آزادیٔ اظہار کو اپنا نصب العین ٹھہرایا۔ ان کی ذہانت، نفاست شائستگی، بے لوث محبت اور نرم و گداز لہجہ ان کے اسلوب کا امتیازی وصف قرار دیا جا سکتا ہے۔ انھیں اپنے آنسو ہنسی کے خوش رنگ دامنوں میں چھپانے کا قرینہ آتا ہے۔ ان کی سدا بہار شگفتگی کا راز اس تلخ حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ معاشرتی زندگی کو ہجوم یاس کی مسموم فضا سے نجات دلائی جائے اور ہر طرف خوشیوں کی فراوانی ہو۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خواتین کی تحریروں میں پائی جانے والی زیر لب مسکراہٹ ان کے ضبط کے آنسوؤں کی ایک صورت ہے ان کا زندگی کے تضادات اور بے اعتدالیوں پر ہنسنا اس مقصد کی خاطر ہے کہ کہیں عام لوگ حالات سے دل برداشتہ ہو کر جبر ستم سہتے سہتے رونے نہ لگ جائیں۔ نسائیات نے خواتین کے مزاج، مستحکم شخصیت اور قدرتی حسن و خوبی کی لفظی مرقع نگاری پر توجہ دی۔ قدرت کاملہ نے خواتین کو جن اوصاف حمیدہ، حسن و خوبی اور دلکشی سے نوازا ہے اس کا برملا اظہار ان کی تحریروں میں ہونا چاہیے۔ ان کی تحریریں ایسی دلکش ہوں کہ ان کی اثر آفرینی کا کرشمہ دامن دل کھینچے۔ جمالیاتی احساس اور نزاکت بیان کے ساتھ جذبوں

کی تمازت خلوص کی شدت ، بے لوث محبت ، پیمان وفا کی حقیقت اور اصلیت اور لہجے کی ندرت سے یہ صاف معلوم ہو کہ اس تحریر کے سوتے حسن فطرت سے پھوٹتے ہیں۔ ہیلن سکسوس) Helen Cixous) نے خواتین کے جسمانی حسن، جنسی جذبات اور احسات کے اظہار کے حوالے سے لکھا ہے۔ (5) "Write youself your body must be heard "

اردو شاعری میں تاریخ اسلام کے عہد زریں کو خواتین نے ہر عہد میں لائق تقلید قرار دیا۔ نسائیات کا مطالعہ کرتے وقت موضوعات کا یہ درخشاں پہلو اور عظیم شخصیات کی ابد آشنا سیرت کا بیان اسلوب کو زرنگار بنا دیتا ہے۔ تاریخ اسلام کی متعدد اہم خواتین کا تبلیغ اسلام میں ایثار پر مبنی تاریخی کردار مسلمہ ہے۔ خاتون تخلیق کاروں نے اس جانب بھرپور توجہ دی ہے۔ حمیدہ معین رضوی نے اپنی نظم ''ام ایمن'' میں حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کی دیرینہ خادمہ کو نہایت عقیدت سے یاد کیا ہے۔ یہی وہ عظیم خاتون ہے جس نے حضرت آمنہ کی وفات کے بعد حضور کو اپنی گود میں لیا۔ اس موضوع پر یہ عمدہ نظم ہر اعتبار سے نسائیات کا ایک موقر اور معتبر حوالہ ہے۔

اُمِّ ایمن

کہا ہے رب حکیم نے یہ
میں خود ہی کرتا ہوں منتخب ۔۔۔ اپنی پیاری محبوب ہستیوں کو
کسی بھی مذہب کی ہوں وہ حامل ۔ پھر ان کو خود بخشتا وسیلہ ہوں نور اماں کا
وہ سب ہی کیسے نصیب والے ہیں لوگ ایسے
ازل سے لے کر ابد کی حد تک
ہزاروں محبوب ہستیاں تھیں گزر گئیں جو
نہیں کوئی امّ ایمن ایسا ۔ کہ رنگ جس کا تھا رنگ اسود ، مگر تھی روح ان کی نور پر نور۔
وہ فرد واحد ۔ کہ جس نے سلطانؐ دو جہاں
کو اٹھایا ہاتھوں میں ۔ سب سے پہلے ۔۔۔ کسی بشر کو ۔ کسی ملک کو نہیں یہ عزت عطا ہوئی ہے

نہیں تھا رشتہ کوئی بھی خوں کا مگر دیا پیار اس نے ماں کا

انھیں نے آغوش میں رسولؐ خدا کو پالا

وہ شاہؐ کونین پہ تھی قرباں

تھی سابقون الاولین دیں میں

ہو وحشت، صحرا سفر حضر ہو معاشرت ہو معاونت ہو

ہو خار زاروں کی نالہ زاری

شہادتوں کی ہو آہ و زاری

خدا کے محبوبؐ کی وہ شیدا

کہ جس کی الفت ہوئی ہویدا۔

رسول اقدسؐ نے دی بشارت لکھی ہے قسمت میں اس کی جنت

وہی تھیں موجود وقت آخر بھی، جب شہنشہؐ نے آخرت کا سفر تھا باندھا

انھیں نے ماں جیسا احترام آخرش ہے پایا، رسول اکرمؐ یہ کہتے اکثر

مجھے جنم دینے والی ماں گرچہ رنگ ابیض، مگر مجھے پالنے میں الفت لٹانے والی۔۔ یہ رنگ اسود

ہے ماں یہ میری مجھے جو جی جان سے ہے پیاری قریب اس سے نہیں ہے کوئی۔

عزیز اس سے نہیں ہے کوئی۔ درود اس پر سلام اس پر وہ جس کی ماں تھی۔ جو رکھتی تھی نفسِ مطمئنہ۔۔ وہ

امّ ایمن نبیؐ کی پیاری۔ وہ راضی اللہ سے۔۔ ہے اللہ اس سے راضی

نسائیات کے حوالے سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ نسائی لب ولہجہ ہمیشہ سے انفرادیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خواتین بولیں تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان کی دلچسپیاں، وابستگیاں اور رعنائیاں ان کی تحریر کو ندرت اور تنوع عطا کرتی ہیں۔ عالیہ تقوی کی نظم ''تاج محل'' میں جہاں نسائی جذبوں کا برملا اظہار ہے وہاں اس میں عصری آگہی کا عنصر بھی قابل توجہ ہے۔ نئے دور میں دو پیار کرنے والے کس انداز میں سوچتے ہیں اور ان کے عہد و پیمان اور تحفظات کیا ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

تاج محل

اپنی بیگم کی یاد میں جیسا — جب کہیں جا کے تاج بن پایا
اک شہنشاہ نے بنایا تھا — میں تو تیرے بغیر دنیا میں
میرے مرنے کے بعد میرے لیے — ایک پل بھی جی نہیں سکتا
کیا بناؤ گے ایسا تاج محل — یہ بتا تیرے بعد میرے لیے
بنتے ہیں پورے بیس سال لگے — پھر بناؤں گا کیسے تاج محل

آخری عہدِ مغلیہ میں جب پورا معاشرتی ڈھانچہ لرزہ براندام تھا تو ان لرزہ خیز حالات میں اخلاقی اقدار کو شدید ضعف پہنچا ہوا تھا، بدذوقی، بے غیرتی اور بے ضمیری کا عفریت ہر طرف منڈلا رہا تھا۔ اس عہد میں ریختی کا وجود میں آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ پورا معاشرہ بے حسی کا شکار ہو گیا تھا۔ شعرا نے نسائی لب و لہجہ میں شاعری کی اور اس سے تلذذ کی صورتیں تلاش کیں۔ ریختی اور نسائیات میں بعد المشرقین ہے۔ نسائیات کا مقصد حسن کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنا تھا۔ اس کے برعکس ریختی ابتذال کی ایک بھونڈی شکل ہے۔ ریختی تخلیق کار کے ذہنی انتشار کی عکاسی کرتی ہے جب کہ نسائیات حسن کے اعجاز سے جہانِ معانی کی تخلیق کے ذریعے جذبات کے مدوجزر کو حقیقی انداز میں پیرایۂ اظہار عطا کرنے کے امکانات سامنے لاتی ہے۔ نسائیات کا اندازِ دل ربائی دراصل حسن کی ایسی کرشمہ سازی ہے جو قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر اس کے احساسات پر مائل کرتی ہے اور خون بن کر رگِ سنگ میں اترنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ نسائیات نے تنہائی اور اجنبیت کی مسموم فضا سے نکلنے کی مقدور بھر سعی کی۔ مسلسل شکستِ دل کے باعث مظلوم اور دکھی انسانیت کی آواز ایک ہم محمل کے کراہتے ہوئے دردانگیز نالے کے روپ میں سنائی دیتی ہے۔ نسائیات نے فرد کو ذہنی اور روحانی تنہائی کے عقوبت خانے سے باہر نکال کر ہست و بود کو بار بار دیکھنے پر آمادہ کیا۔ اس طرح یہ ایک موثر لہجہ ثابت ہوا جس کی تاثیر سے خزاں میں بھی بہار کے حسین جھونکے دلوں کو راحت عطا کرتے ہیں۔ نسائیات میں پنہاں جمالیاتی کیفیات کا نظارہ

دیدہ بینا کے لیے حوصلے، امید اور ولولۂ تازہ کا نقیب ثابت ہوتا ہے۔

نسائیات کے علم برداروں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو منصۂ شہود پر لانے کے لیے اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور احساس کو اساس بنایا۔ ان کے خیالات عصری آگہی کا بلند ترین معیار پیش کرتے ہیں۔ یہ کوئی ہوا میں گرہ لگانے والی صورت ہرگز نہ تھی بلکہ اس اسلوب سے افکار تازہ کے ایک غیر مختتم سلسلے کا آغاز ہوا۔ اس کی بازگشت دنیا بھر میں سنائی دی۔ نسائیات کے حوالے سے خواتین میں تخلیقی فعالیت کا جو شعور پیدا ہوا اس کی بدولت زندگی کی حقیقی معنویت کی تفہیم میں مدد ملی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیبی اور ثقافتی سطح پر یہ ادعا سامنے آتا ہے کہ اقوام عالم اکملیت کی سمت رواں دواں ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ہوس زر نے نوع انساں کو ایک ایسے انتشار اور پراگندگی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے جس نے زندگی کی درخشاں اقدار و روایات کو گہنا دیا ہے۔ حساس تخلیق کار خود کو جزیرۂ جہلا میں محبوس پاتے ہیں۔ چاروں جانب مہیب بحر خار ہے جس کی ہر موج میں حلقۂ صدکام نہنگ ہے۔ ایسے میں نہ تو کوئی امید بر آتی ہے اور نہ ہی اصلاح احوال کی کوئی صورت دکھائی دیتی ہے۔

آج کا اردو ادب جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی مقدور بھر کوشش کر رہا ہے۔ خواتین کی کثیر تعداد پرورش لوح و قلم میں مصروف ہے۔ خواتین نے حیاتیاتی امور پر بھرپور توجہ دی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عالمی ادبیات کے تیزی سے بدلتے ہوئے رجحانات پر خواتین کی گہری نظر ہے۔ آلام روزگار کے مہیب بگولوں کی زد میں رہنے کے باوجود خواتین نے اپنا وجود برقرار رکھا ہے۔ ہوائے جور و ستم میں بھی انھوں نے شمع وفا کو بجھنے نہیں دیا۔ تاریخ کا مسلسل عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ خواتین نے سعی پیہم کے ذریعے اپنے کام کی اہمیت اور افادیت کو ثابت کیا ہے اور پتھروں سے بھی اپنی فعالیت کی تاثیر کا لوہا منوایا ہے۔ موضوعاتی تنوع ان کی تحریروں کا امتیازی وصف ہے۔ تاریخ، معیشت، جغرافیہ، مذہب، تہذیب اور معاشرت کا کوئی بھی شعبہ ان کی دسترس سے باہر نہیں۔ بعض اوقات مواد اور خیالات کی فراہمی کے لیے وہ کلاسیکیت سے استفادہ کرتی ہیں تو بعض اوقات انھیں رومانویت میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات

اور پس ساختیات کے مباحث کا پرتو بھی ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ کہیں تو یہ مارکسزم سے خیالات اخذ کرتی ہیں اور کہیں جدید نفسیات کا معتبر حوالہ بن کر سامنے آتی ہیں۔ غرض ایک دھنک رنگ منظر نامہ ان کی تخلیقی فعالیت میں اپنی پوری ضیا پاشیوں سمیت نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے۔ نسائیات کی اس صد رنگی ہمہ گیری، دل کشی اور موضوعاتی تنوع کے متعلق گیاتری چکرا ورتی سپی واک (Gyatri Chakaravorty Spivak) نے لکھا ہے۔

" Feminism lives in the master.text as well as in the pores. It is not determinant of the last instance. I think less easily of changing the world, than in the past." (6)

خواتین کے اسلوب میں حق گوئی، بے باکی اور حریت فکر کی جو منفرد اور دلکش صورت موجود ہے وہ تخلیقی عمل کو ایک شان استغنا سے متعارف کراتی ہے۔ متعدد تخلیق کاروں نے نسائیات کے زیر اثر نہایت زور سے اپنی آواز اٹھائی ہے مثال کے طور پر عصمت چغتائی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے افسانے 'لحاف' میں ایک کردار بیگم جان کی حرکت اس کے نا آسودہ جذبات اور ابنار ملٹی کا پتا دیتی ہے۔ بلکہ ان تمام حسرتوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو بیگم جان کے شوہر کے ابنارمل ہونے کے باعث دل میں خون ہو گئیں۔

نسائیات کا ڈسکورس ہمیشہ سے متنوع رہا ہے۔ ہمارا معاشرہ بے حسی کا شکار ہے اجلاف وارزال اور سفہانے مجبوروں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ علاقائی، لسانی اور نسلی امتیازات نے انسانیت کو انتشار کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ فرائڈ نے عورت کے جذبات کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کو محض جنس تک محدود سمجھنا صحیح انداز فکر نہیں ہے۔

خواتین نے انسانیت کی فلاح اور انسانی حقوق کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے، انسانیت پر کوہ ستم توڑنے والوں کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں، ان کا پیغام دکھی انسانیت سے خلوص اور دردمندی پر مبنی بے لوث محبت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محروم طبقے سے عہد وفا استوار رکھنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ ہر فرعون، نمرود، ہلاکو خاں اور شمر کے خلاف انھوں نے نوک قلم سے جہاد کیا ہے

نسائیات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کی تحریروں میں ظلم و جبر کی ہر صورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے پر توجہ رہی ہے۔ ظالم کہیں بھی ہو اور کسی بھی مقام پر ہو اس پر لعنت بھیجنا خواتین کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ ظلم سہنا اور اس کے خلاف آواز بلند نہ کرنا منافقت کی دلیل ہے۔ پروین شاکر نے کہا تھا:

مقتل وقت میں خاموش گواہی کی طرح　　دل بھی کام آیا ہے گم نام سپاہی کی طرح
ظلم سہنا بھی ہوا ظلم ہی اک حد کے بعد　　خامشی بھی تو ہوئی پشت پناہی کی طرح
(۱۱)

جہاں تک فرائڈ اور مارکس کے انداز فکر کا تعلق ہے ان دونوں کے مابین کافی ابہام پایا جاتا ہے۔ ان دانشوروں نے نسائیات کو محض جنس کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواتین نے ہمیشہ اپنی عزت و ناموس کو اپنی متاع بے بہا سمجھا ہے۔ فسطائی جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے نسائیات کی علم بردار خواتین نے غیر منصفانہ اور استحصالی نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے دنیا بھر کی خواتین کے لیے ایک واضح لائحہ عمل متعین کر دیا۔ خواتین تحقیق کاروں نے پرورش لوح و قلم کرتے ہوئے اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ زندگی کی حقیقی معنویت کو اجاگر کرنے میں کوئی کوتاہی سرزد نہ ہو۔ نسائیات کے جواز اور اثبات کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ممتاز نقاد جولیٹ مچل (Juliet Michel) نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا:

"I do not think that we can live as human subjects without, in some sense, taking on history, for us it is mainly the history of being men or women under bourgeois capitalism. In deconstructing that history we can only construct other histories, what are we in process of becoming. (4)

ماضی میں معاشرتی ڈھانچہ جو بھی رہا ہو اور اس کے تجربات نے جو بھی گل کھلایا ہو اب اس کی تکرار بے سود ہے۔ اس نظامِ کہنہ کی حیثیت گرتی ہوئی عمارت کی ہے۔ اس کے سائے میں عافیت سے بیٹھنے کا خواب دیکھنے والے اپنے سوہو متخیل کی شادابی سے خود فریبی کا شکار ہیں۔ تاریخ کا ایک مسلسل عمل ہوتا ہے جس کے بارے میں آگہی ضروری ہے۔ اردو ادب میں نسائیات کے موضوع پر متعدد تخلیق کاروں نے طوفانِ حوادث میں بھی اپنے افکار کی شمع فروزاں رکھی۔ قرۃ العین حیدر کے اسلوب میں نسائیات ایک منفرد انداز میں ضوفشاں ہے۔ ان کی تحریروں کا ڈسکورس انسانیت سے قلبی لگاؤ، غریب، بے سہارا، مظلوم اور بے بس انسانوں کے دکھ درد میں شرکت اور ظلم سے شدید نفرت کا عنصر قابلِ قدر ہے۔ وہ اس جانب متوجہ کرتی ہیں کہ وقت کی مثال ایک سیلِ رواں کی ہے جس کی مہیب متلاطم موجیں سرعت سے گزر کر سب کچھ بہا کر لے جاتی ہیں۔ کوئی بھی شخص کتنی شدید تمنا کرے گزرے ہوئے وقت کے اس سیلِ رواں کے لمس سے دوبارہ فیض یاب نہیں ہو سکتا۔ کائناتی وسعت اور سیلِ زماں کے متعلق ان کی تحریروں میں جو اندازِ فکر جلوہ گر ہے وہ حرفِ صداقت کی عمدہ مثال ہے۔ دریا کی موجیں، ندی کا بہاؤ یہ سب وقت کی اصلیت کی علامت ہیں۔ یہ تمام علامتیں ایک ایسے نفسیاتی کل کی نشان دہی کرتی ہیں جس سے لاشعور کی توانائی متشکل ہو کر فکر و نظر پر انمٹ نقوش مرتب کرتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کاروانِ ہستی بھی رواں دواں ہے۔ وقت کی اس برق رفتاری میں کئی رشتے ناتے شناخت اور یادیں تاریخ کے طوماروں میں دب جاتی ہیں۔ اس کائنات کے تمام مظاہر بتان وہم و گماں ہیں۔ قرۃ العین حیدر کو اس بات کا دکھ ہے کہ سلسلۂ روز و شب جو کہ نقش گر حادثات ہے اس کی اصلیت کو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ہوس کی وجہ سے انسان اپنے ہی ابنائے جنس کے خون کا پیاسا ہے۔ اپنے ناول ''آخرِ شب کے ہم سفر'' جو کہ ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا اس میں انھوں نے بے لاگ انداز میں نسائیات پر مبنی اپنے اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔

نسائیات سے متاثر ہو کر لکھنے والی تخلیق کار خواتین نے تخلیقی ادب کو وسیع تر تناظر میں پیش

کیا۔ ان کا مقصد محض تخلیق ادب تک محدود نہ تھا بلکہ ان کی شدید خواہش یہ رہی کہ تخلیق ادب کے وسیلے سے فرد کی گتھیاں اس طرح سلجھائی جائیں کہ نئے حقائق کی گرہ کشائی ہو سکے۔ اس طرح تخلیق فن کے اعجاز سے جہان تازہ تک رسائی کو یقینی بنایا گیا۔ نسائیات نے اس جانب متوجہ کیا کہ انسان کو یہ جان لینا چاہیے کہ رخشِ عمر پیہم رو میں ہے اور اس کا ہاتھ باگ پر ہے اور نہ ہی پاؤں رکاب میں ہے۔

نسائیات کے زیر اثر خواتین نے اپنی تخلیقی تحریروں کو اس مہارت سے پیش کیا کہ ان کی شخصیت ان کے اسلوب کے ذریعے نکھر کر سامنے آ گئی۔ خواتین کی تخلیقی تحریروں کے موضوعات ان کی انفرادیت کو دلکش انداز میں سامنے لاتے ہیں۔ انھوں نے ادب اور زندگی کے مابین ایک واضح تعلق کو برقرار رکھتے ہوئے اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا کہ اپنی اصلیت کے لحاظ سے زندگی کو حادث طاقتوں کے باہمی عمل اور رد عمل کی ایک انوکھی اور نا قابل فہم صورت خیال کیا جاتا ہے۔ خواتین نے ایک ایسے تہذیبی رویے کو پروان چڑھانے کے لیے انتھک جدوجہد کی جس کا تعلق نسل انسانیت کی بقا، استحکام اور دوام سے ہے یہ تحریریں صداقت نگاری اور فطرت نگاری کا دلکش نمونہ ہیں۔ ان میں تہذیبی اور ثقافتی رویے پوری آب و تاب کے ساتھ سمٹ آئے ہیں۔ تاریخ، تہذیب اور ارضی و ثقافتی حوالوں کا یہ وسیع اور حقیقی شعور ان تخلیقات کا نمایاں ترین وصف ہے۔ نسائیات کا تجرباتی مطالعہ کرتے وقت تخلیق کار خواتین کے جان دار اسلوب کی تاثیر مسلمہ ہے۔ ان کی ذات اور مزاج کے تمام تر پہلو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ ورجینیا وولف (Virginia Woolf) کا خیال ہے۔

" A woman' s writing is always feminine, It can not help be ng feminine, at its best, it is most femine, the only d fficulty lies in defining what we mean by feminine" (۸)

نسائیات کے اثرات کی حامل وہ تمام تخلیقی تحریریں حرف صداقت سے مزین ہو کر ابلاغ کو یقینی بناتی ہیں۔ اس طرح خواتین نے ایک ایسی ذہنی فضا تیار کی جس میں حریت ضمیر سے زندگی بسر کرنے کی منفرد صورت سامنے آئی اور ایک ایسی دلکش تبدیلی رونما ہوئی جس کے اعجاز سے سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ مستحکم شخصیت کے سوتے انسانی کردار سے پھوٹتے ہیں۔ خواتین نے ہر دور میں تعمیر سیرت و کردار کو اپنا نصب العین بنایا۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں انھوں نے تذبذب اور گومگو کی کیفیت سے نجات حاصل کر لی اور ایک والہانہ پن سے تخلیق فن کی طرف مائل ہوئیں۔ اگرچہ خواتین کا تخلیقی اسلوب تنوع اور دلکشی کی وجہ سے قاری کو متوجہ کرتا ہے لیکن بعض اوقات اسے مردوں کی تخلیقات سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ مرد حضرات بعض نفسیاتی وجوہات کے باعث عورتوں کے نام سے خود کو ادبی حلقوں میں متعارف کراتے ہیں۔ کواکب جیسے نظر آتے ہیں اس طرح نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہ بازی گر کھلا دھوکا دے کر صحیح نتائج تک رسائی کے راستے میں حائل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح تخلیقی تحریروں کا گڈمڈ ہو جانا کئی مغالطے پیدا کر سکتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں ذوقِ نمود و نمائش اور نصب العین کے تصورات کا حقیقی ادراک عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ ایک تخلیق کار پس منظر میں رہتے ہوئے بھی اپنی تخلیقی فعالیت سے قلب و نظر کو مسخر کر کے اپنی صلاحیتوں کو منوا سکتا ہے۔ نسائیات پر مبنی انداز فکر کی حقیقی تفہیم پر توجہ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نسائیات کے متعلق متعدد امور میں ابہام پایا جاتا ہے۔ اس موضوع پر ہیلن سکسوس (Helen Cixous) کی تجزیاتی رائے قابل غور ہے۔

> " It is impossible to define a feminine practice of writing and this is an impossiblity that will remain for this practice will never be theorizd, enclosed, encoded... which does not mean that it does not exist. (4)

مردوں کی اکثریت اور غلبے والی معاشرت میں بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ نسائیات پر مبنی سوچ اور خواتین کا کلچر اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ذیلی کلچر (sub Culture) کے سوا کچھ نہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک منفی سوچ ہے اس کے مسموم اثرات سے معاشرے کا ایک بڑا طبقہ اپنے جائز حقوق سے محروم ہو جاتا ہے۔ ماہرین عمرانیات اس امر پر متفق ہیں کہ بجائے باہمی کے اصولوں کے تحت خواتین کی منفرد اور علاحدہ حیثیت معاشرتی زندگی میں نکھار کے لیے ناگزیر ہے۔ خواتین کا طرز حیات اور اسلوب بیان اردو ادب میں ابتدا ہی سے منفرد رہا ہے۔ ان نازک معاملات تک رسائی مردوں کے لیے ناممکن ہے۔ اس ڈسکورس میں صرف خواتین کو خلاقانہ دسترس حاصل رہی ہے اردو شاعری میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

اردو ادب میں نسائیات کا وجود ہر صنف ادب میں ملتا ہے۔ کئی باصلاحیت خواتین نے فروغ علم و ادب میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ صحافت میں محترمہ رضیہ مشکور نے اپنے مجلّہ "دیدہ ور" کو گزشتہ چار برس سے امریکہ سے انٹرنیٹ پر پیش کر کے ایک مستحسن کام کیا ہے۔ علی گڑھ کلب کی صورت میں ان کے ساتھ ممتاز اہل علم خواتین کی بڑی تعداد مصروف عمل ہے۔ ان میں محترمہ ڈاکٹر طیبہ قدوائی، شہناز خانم عابدی صاحبہ، فرزانہ اعجاز، شہناز کنول، عشانہ اختر جمال اور بہت سی دیگر قابل اور مستعد خواتین نے اپنے تخلیقی کام سے یہ محفل سجا رکھی ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو کا سلسلہ جاری ہے۔ محترمہ صدیقہ بیگم تاریخی ادبی مجلّہ "ادب لطیف" لاہور سے شائع کر رہی ہیں، یہ رجحان ساز مجلّہ گزشتہ پچھتر سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ مارچ ۲۰۱۱ء میں ادب لطیف کا پچھتر سالہ نمبر بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ محترمہ عذرا اصغر صاحبہ کا ادبی مجلّہ "سہ ماہی تجدید نو" لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ ان کی ہونہار ادیبہ بیٹی شبہ طراز ان کی معاون ہیں جو فن مصوری میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ محترمہ ڈاکٹر شفیقہ قادری صاحبہ اردو تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ پروفیسر مسز شمیم حلیم نے اردو خاکہ نگاری کی ترویج و اشاعت میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ حال ہی میں عالمی شہرت کے حامل ادیب اور دانش ور "حسن چشتی" پر ان کا ایک خاکہ ڈیکنز میگزین

ٹورنٹو (کینیڈا) میں ۱۰ مارچ ۲۰۱۱ کو شائع ہوا ہے۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت قابل توجہ ہے۔

خواتین میں اس وقت بیداری کی جو لہر پیدا ہوئی ہے وہ تاریخ کے مسلسل عمل کا ثمر ہے۔ جذبات و احساسات کی تونگری، تخیل اور شعور کی بے پناہ وسعت اس عہد نا پرسان میں ذاتی محنت اور علمی ثروت کے اعجاز سے خواتین نے اپنی تحریروں کو ذہن و ذکاوت کی بیداری کے لیے استعمال کیا اور بے پناہ اثر آفرینی سے مزین کیا۔ ممتاز شیریں نے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"مجھ میں فن کاری کا ادعا سہی لیکن اتنا انکسار تو ضرور ہے کہ یہ محسوس کر سکوں کہ بڑے ادیبوں کے سامنے ہم کتنے چھوٹے ہیں اور فن کے ارتقا اور تکمیل تک پہنچنے میں ہمیں ابھی کتنے اور مرحلے طے کرنے ہیں۔ میں اپنے بارے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ پہلے درجے سے گزر کر میں نے دوسرے میں قدم رکھا ہے۔"

محترمہ بانو قدسیہ نے اردو زبان و ادب کی ثروت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ان کی تحریروں میں تخلیقی بصیرت، کمال فن، لفظی مرقع نگاری، سراپا نگاری عروج پر ہے۔ نسائی نفسیات کا وسیع مطالعہ ان کا خاص موضوع ہے۔ "راجہ گدھ" جیسا شہ کار ناول لکھ کر انھوں نے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کی۔

نسائیات پر مبنی تنقیدی انداز فکر نے ۱۹۹۰ کے بعد اپنی اہمیت، افادیت اور مقبولیت کا لوہا منوایا ہے آج خواتین نے ادب اور فنون لطیفہ میں اپنی صلاحیتوں کی دھاک بٹھا دی ہے۔ فطرت اور ماحول سے خواتین کی یگانگت اور گہرا ارتباط ان کی تحریروں کا امتیازی وصف ہے۔ ان کے معجز نما اثر سے جہد البقا کے موجودہ زمانے میں خواتین کی تحریریں خود اپنا اثبات کرتی ہیں۔ نفسیاتی حوالے سے عورت، جنس اور جذبات کو اہم حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ان کی تحریریں خلوص اور دردمندی کی مظہر ہیں۔ نسائیات پر مبنی تنقید میں جہاں حیاتیاتی تناظر میں بات کی جاتی ہے وہاں خد و خال کی دلکشی پر بھی توجہ مرکوز رہتی ہے اور بعض ناقدین حسن صورت کو تخیل کا منبع قرار دیتے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ایثار، وفا، محبت اور ہجر و فراق کے موضوعات پر خواتین کا انداز دل کی دھڑکنوں سے ہم

آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہ بات مردوں کی تحریروں میں عنقا ہے۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نسائیات ایک واضح صداقت کا نام ہے۔ اسے ایک خاص طبقے یا صنف کی تخلیقات کا مخزن قرار دینا درست نہ ہوگا۔ نہ ہی اسے حیاتیاتی عوامل کی بنا پر الگ حیثیت ملنی چاہیے۔ بلکہ یہ ادب ہے جو ایک خاص بود و باش رکھنے والی اور منفرد طرز معاشرت کی حامل خواتین سے منسوب ہے۔

خواتین نے ہر دور میں تاریخی آگہی (Historical Awareness) اور عصری آگہی پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ان کے ہاں معروضیت (Objectivity) کا عنصر نمایاں رہا ہے۔ مابعد جدیدیت کی ایک پیچیدہ (Complex) صورت حال واضح دکھائی دیتی ہے۔

خواتین نے اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان اقدار و روایات کو پروان چڑھانا چاہیے جن کے اعجاز سے معاشرتی زندگی میں خیر و فلاح کے امکانات کو یقینی بنایا جا سکے۔ جبر کا ہر انداز مسترد کر کے اخلاقیات کے ارفع معیار تک رسائی پر توجہ دی جائے۔ انفرادی اور اجتماعی لاشعور کی جو کیفیت خواتین کی تخلیقات میں جلوہ گر ہے اس کا تعلق دروں بینی سے ہے۔

اردو ادب میں خواتین نے ہر صنف ادب میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

ادا جعفری کی یہ نظم "شہر آشوب" نسائیات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

شہر آشوب

ابھی تک یاد ہے مجھ کو — خون کے دھبے نہ ہوتے تھے
مرے آنگن میں خیمے تھے دعاؤں کے — دھوئیں کے ناگ کا پہرا نہ ہوتا تھا
یقین آئے نہ آئے میرے بچوں کو — کہ وقتوں کی باتیں ہیں

گئے وقتوں کا قصہ ہے — مرے بچوں کو شاید ہی یقیں آئے
کہ برگِ گل بھی قدموں سے کچل روندا نہ جاتا تھا — در و دیوار کے اوپر
ہوا برگشتہ گام آتی نہ تھی پہلے — کسی آسیب کا سایا نہ ہوتا تھا
یقیں اغوا نہ ہوتا تھا — کبھی تنہا تھے لیکن یوں کوئی تنہا نہ ہوتا تھا
مرے آنگن میں نقشِ پا بچے تھے — ابھی تک یاد ہے مجھ کو

آج ہمیں ہوا کی دستک کو سن لینا چاہیے۔ آنے والی رُت بہت کڑی ہے۔ حصارِ جبر کی اندھی فصیل کو منہدم کرنے کے لیے کو بہ کو بیداری کا پیغام پہنچانا ہوگا۔ بے چہرہ لوگوں اور بے در گھروں میں حوصلے اور امید کی شمع فروزاں کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ خواتین میں احساسِ ذمہ داری اور بیداری کی جو لہر پیدا ہوئی ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔

ماخذ

1 محمد اقبال ڈاکٹر: ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال، اردو، مرتب احمد رضا، ۲۰۰۵، صفحہ ۱۰۲
2 David Lodge: Modem Criticism and theory, pearson Education Singapore 2004, page 308
3 Terry Eagletion. Literary Theory. Minnesota, 1998, page 194 London.
4 Ross Murfin. The Bedford Glossary of Critical and literary terms Bedford books Bostan, 1998, page 123
5 Ross Murfin. The Bedford Glossary of Critical and literay terms Bedford books Boston, 1998, page 123
6 David Lodge: Modem Criticism and theory, pearson Education Singapore 2004, page 308
7 David Lodge: Modem Criticism and theory, pearsom Education Singapore 2004, page 192
8 David Lodge: Modern Criticism and theory, pearsom Education Singapore 2004, page 311
9 David Lodge: Modem Criticism and theory, pearsom Education Singapore 2004, page 311

شارق بلیاوی

نسائی ادب۔۔۔ حقیقت یا افسانہ

ایک مدت سے نسائی ادب کا تذکرہ سنتا آرہا ہوں ایک بار اس پر ایک نشست میں مذاکرہ بھی ہوا تھا میں نے وہیں چند معروضات پیش کی تھیں جو نذر قارئین ہیں ادب کا تعلق خالصۃً زبان سے ہے بقول ماہرین ادب زبان کے تخلیقی عمل کا نام ہے دوسرے معنی میں اس کے اندر لسانی عوامل اس قدر مربوط وفعال ہوں کہ ادب کی تمام تر ترجیحات جمالیاتی حسیات اور تخیلاتی مدوجزر کو سہارے کی قوت رکھتے ہوں۔ ورائی دماورائی نیز ظاہر و باطن کی احساساتی موشگافیوں کو عملی رنگ دینے کی صلاحیت بھی ہو جو لفظیات، محاورات، استعارات یعنی تمام علم البیان کی اصطلاحات کے خزانوں سے مزین ومعمور ہو۔ ایسی ہی زبان ادب تخلیق کر سکتی ہے جس کے ایک ایک لفظ میں معنی کا بہاؤ ہو۔ عالمی طور پر تسلیم شدہ بات یہی ہے یہ ادب زبان کے نام سے موسوم ہوتا ہے ہر زبان کا ادب زبان کے نام ہی سے زندہ ہے یہ جو ہم اصناف کی بات کرتے ہیں جیسے نسائی ادب، شعری ادب، افسانوی ادب، مزاحمتی ادب وغیرہ تو یہ ادب کے ذیلی وضمنی عنوانات ہیں جو تخلیق کار کے فکری رویے کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ جزیاتی عنوانات ادب کل کے ہی حصے ہیں یہ ادب کی اضافی شناخت ہیں یہ تخلیق کار کی ذاتی اختصاصی شناخت نہیں یہ عنوانات لکھاری کے طبعی رجحانات ہیں ہمارا معاشرہ، یہ زندگی مکمل کیفیات سے گزرتی ہے اور تخلیقی احساسات اور متاثر کن کیفیات کی ہی مرہون منت ہے۔ زاویہ فکر بدلتا رہتا ہے سو تخلیقی ہیئت بھی بدلتی رہتی ہے تاہم یہ ساری اصناف سخن کسی زبان میں ہی لکھی جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ اسی زبان کا ادب کہلائیں گی۔

ادب کی تخلیق میں عورت مرد کی تخصیص نہیں ادب ادب ہوتا ہے ہاں اگر کوئی مشہور صنفی تخلیق کی بات ہوگی تو لکھنے والے کا نام ضرور آئے گا۔ اس کا تعلق تخلیقی انفرادیت سے ہے۔ ادب کی

اجتماعیت سے نہیں اب یہ خواہش کہ عورتوں کا ادب الگ ہو اور مردوں کا الگ تو یہ فطری طور پر ممکن ہی نہیں۔ کیا تاریخ ادب اسے قبول کرے گی؟ اور کیا ادب کا مزاج اس کے موافق ہوگا؟ یہ ناممکن ہے ہر زبان کا ادب عورت اور مرد کی تحریروں سے بھرا پڑا ہے خواتین کو (چند ایک) یہ شکایت ہے کہ انہیں نظر انداز کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ یہ سوچ میرے لحاظ سے قطعی غلط ہے جن عورتوں نے اپنی علمی استطاعت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے ان کے نام ادب میں روشن ہیں آج بھی قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، ادا جعفری، پروین شاکر چھائی ہوئی ہیں اور بھی خواتین ہیں جو معروف و مشہور ہیں یہ تو مرد کی فطرت کے خلاف بات ہے کہ کسی عورت کو نظر انداز کرے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی عزت افزائی کی جاتی ہے تمام رسائل و جرائد کے مدیران مرد ہی ہیں (دو ایک کو چھوڑ کر) کیا ان رسائل میں یہ خواتین چھپتی نہیں بلکہ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ انہیں ترجیح بھی دی جاتی ہے ان تمام خواتین تخلیق کاروں کی وجہ شہرت سوائے ادب کے اور کیا ہے۔؟ ایک دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ مرد (بعض) عورت کو صرف جنسی واسطے تک محدود رکھے ہوئے ہے مطلب یہ کہ انبساط جنس کا ذریعہ سمجھتے ہیں عرض ہے کہ زندگی کی متصیاب میں جنس کا عنصر غالب ہے جب رائٹر زندگی کے تمام متاثر کن گوشوں پر لکھتا ہے تو جنس کیسے بچے۔ کیا ہمارا معاشرہ ان کرداروں سے خالی ہے جو ادیب یا شاعر کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں آپ دیکھیے عصمت چغتائی، سارہ شگفتہ، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر نے کس کس انداز سے رومانیت یا جنسیت کا سہارا لیا ہے اور یہی ان کی وجہ شہرت بھی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ادیب یا ادیبہ اس شعوری یا لاشعوری رجحان یا حسیاتی کیفیت سے بچ نہیں سکتا مرد نے عورت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ پوری کی پوری شاعری تو ان کے جمالیاتی اوصاف سے بھری پڑی ہے خاص طور سے غزل تو عورت کے حصار ذات سے نکل ہی نہیں سکی وہ وہ تعریفیں ہوئی ہیں کہ خود عورت شرما جاتی ہے اور خوش بھی ہوتی ہے۔ Ballad انگریزی منظوم صنف ہے۔ دنیا بھر کا کوئی رزم نامہ پڑھ لیجیے ایلیڈ کے ہیلن کو، ہومر کی ایبڈ کو، اسپنسر کی فری کوئین، ملٹن کی فردوس گمشدہ (اس میں تو ہیروئین ہیں) دانتے کی معرکتہ الآرا نظم"

طربیہ خداوندی" اس کی محبوبہ بیٹرس کے محور پر رقص کرتی ہے۔ رامائن میں سیتا کا کردار فردوسی کا شاہنامہ یعنی ہزاروں کتب ہیں جہاں عورت نظر آتی ہے بلکہ محرکِ تخلیق بھی ہے۔ افسانوں اور ناولوں میں بھی عورت کے کردار کو اہمیت دی گئی ہے۔ پھر بھی شکایت ہے کہ نظر انداز کی جاتی ہیں۔ میں سماج یا سیاست کی بات نہیں کرتا۔ ادب میں وڈیرہ شاہی یا جاگیردارانہ نظام رائج نہیں یہاں بیوروکریسی یا لینڈ ورکریسی کا عمل دخل نہیں۔ ادب ادب ہے اپنے آپ کو منوا کر رہے گا ہم نہیں مانیں گے کوئی اور مان لے گا۔ اگر کسی نے کوئی منفی خیال ظاہر کیا یا منفی تنقید کی تو تنقیدی عمل ایک مختلف چیز ہے۔ غالب سے لے کر علامہ اقبال یا فیض اور قاسمی کس پر منفی تنقیدیں نہیں کی گئیں تو کیا یہ ہستیاں ادب کے دائرہ سے باہر ہو گئیں؟ ایسا نہ ہے نہ ہوگا بلکہ آپ کی کوئی ایک تخلیق بھی مشہور یا معروف ہو گئی تو ادبی دنیا میں آپ زندہ ہیں۔ یہ نظر انداز کرنے والا اختراعی رجحان بے جا ہے۔ آپ باہر نکلیں، اور کچھ کر کے دکھائیں۔ مردوں کے برابر آنے کے لیے جرأتِ مردانہ پیدا کریں۔ جس نے خود کو پہچان لیا اپنی قدر کو سمجھ لیا وہ آگے آ گئی صرف مردوں کی برتری کے احساس یا منفی خیالات کی دلدل میں پھنس کر لعن طعن کرنے سے کیا ہوگا۔ یہ تھوڑی برتری ابتدائے آفرینش میں دی گئی اس دنیا یا عالمِ کون و فساد میں زندہ رہنے کے لیے صلابت، جلا، قوت، جواں مردی، ہمت، سخت گیری اور تھوڑی تند مزاجی کی بھی ضرورت تھی۔ سو مردوں میں یہ خصوصیات پیدا کی گئیں ورنہ اس مشقت طلب، خطرات سے پُر، مصائب سے بھرے ارضی ماحول میں کوئی کیسے زندہ رہتا۔ موسم کی سخت گیری، حشرات الارض درندوں وغیرہ سے کون نبرد آزما ہوتا۔ پہاڑ کون توڑتا نہریں کون نکالتا کھیتوں کا سینہ چیر کر چلچلاتی دھوپ میں غلہ کون اُگاتا؟ جب انسان میں اس قدر لڑنے اور مزاحم ہونے کی قوت ہو تو وہ تھوڑی شان بھی دکھائے گا یہ منجانب خدا ہے۔ عورت کو حسن، ناز، نرمی، محبت، نازک اندامی، عشوے، غمزے، ادائیں یہ خوبیاں اس لیے دی گئیں کہ اس سخت گیر جلال آشنا انساں کے دل میں اپنے حسن و جمال سے نرمی پیدا کرے۔ دلوں میں گداز بھر دے اور زندگی کے صحیح رخ پر ڈال دے اسی میں نسلِ انسانی کی بقاء تھی اور ہے ورنہ یہ انسان یعنی مرد نہ خود

ہوتا نہ کسی شے کو رہنے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ عورت میں بلا کی جنسی کشش پیدا کی گئی تاکہ مرد کے اندر مرغوبیت پیدا کرے، اگر یہ جنسی کشش نہ ہوتی تو عورت کو کون پوچھتا۔ پھر نسل انسانی کا کیا ہوتا خیر یہ ساری باتیں ضمنی ہیں اس سے مراد یہ نہیں کہ عورت کی ہستی صرف کھلونا ہی ہے۔ عورت کو مساوی حقوق خدا نے دیے ہیں اس کے ساتھ نہایت نرمی اور محبت سے پیش آنے کو کہا گیا ہے کہ یہ نازک ترین مخلوق مردانہ جاہ و جلال کی تاب ایک پل کو نہ لا سکے گی۔ مفاد دونوں کا مشترک ہے یہ ساری باتیں دنیاوی معاملات برتنے کے لیے ہیں۔ دبی معاملات میں کمتر یا برتر کا کوئی اصول معین نہیں یہ اپنی اپنی کارگزاریوں پر منحصر ہے۔ اگر عورت اپنے احساس کمتری اور رجحان ناآسودگی کے سحر سے نکل جائے تو بڑے سے بڑے کارنامے انجام دے سکتی ہے بلکہ کچھ نے دیئے بھی ہیں۔ ادب کی دیوی ہر شخص کا استقبال کرتی ہے عورت ہو یا مرد جو اس کی آغوش میں جانا چاہے یہاں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ آج نسائی ادب کی بات کی جاتی ہے جو سراسر ذہنی آسودگی اور خواہ مخواہ کی مریضانہ سوچ کی مظہر ہے اور یہ حتمی خیالات کچھ عورتوں کو ورثے میں ملے ہیں ازل سے آج تک عورتوں کو مردوں سے شکایات رہی ہیں وہ مردوں کو کبھی غالب یا برتر دیکھنا نہیں چاہتیں۔ خواہ بیوی ہو یا کوئی اور۔ آپ قدرت کا نظام تبدیل نہیں کر سکتیں۔ نسائی ادب کی پرچارک یہ ذہن میں رکھ لیں کہ ان کی تمام تر کوششیں بے سود ہوں گی اور اس میں کسی مرد کا ہاتھ نہیں ہوگا بلکہ ادب کی ترجیحات، اس کا مزاج اسے قبول نہیں کرے گا۔ ایک ادب نسائی اس لیے نہیں ہو جائے گا کہ اسے کسی عورت نے لکھا ہے۔ ادب نام نہیں دیکھتا وہ تو کام دیکھتا ہے ایک بات میں عرض کر دوں کہ میری اس تحریر کا مقصد باخدا یہ نہیں کہ میں اس تحریک کے خلاف اس لیے ہوں کہ یہ نسائی تحریک ہے بلکہ حقائق کی روشنی میں بات کی ہے۔ عورت میرے لیے کل بھی قابل ستائش و صد احترام تھی اور آج بھی ہے کہ میں سب کی باتیں رد کر سکتا ہوں مگر اپنے خدا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو نہیں۔ میں نے اپنے ایمان و یقین کی روشنی میں یہ لکھا ہے اور بھی بہت سارے دلائل ہیں مگر اس چھوٹے سے مضمون میں جگہ نہیں۔ جو خواتین اس قسم کے خیالات رکھتی ہیں اپنے دل

سے نکال دیں حسد کی جگہ رشک پیدا کریں اور آگے آئیں اپنی توقعات سے زیادہ سراہی جائیں گی۔ یہ مرد کی فطرت کا حصہ ہے عورت کسی محاذ پر نظر انداز کی ہی نہیں جاسکتی اگر وہ عورت کے روپ میں پیش ہو۔ عورت کی تمام حیثیتیں عورت کی پُر جمال شکل میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ اپنی فطری صفات سے ہٹ کر عورت ہو یا مرد بدنما ہو جاتا ہے۔ اپنے اپنے دائرۂ متعینہ میں ہر کوئی اچھا لگتا ہے ہمیشہ تشکیک پر مبنی سوچ ذہنی ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ عورتوں نے بھی دنیا میں بڑے بڑے کارنامے اپنی اوقات سے بڑھ کر انجام دیئے ہیں ان کے نام بھی تاریخ میں زندہ ہیں آپ پیچھے مڑ کر دیکھیں تاریخ ادب یا تاریخ سیاسی کا مطالعہ کریں آپ کو شکایت نہ رہے گی۔

زرِ تعاون کے لئے چیکوں کی تر

جو کرم فرما سہ ماہی 'الاقرباء' کو سالانہ زرِ تعاون اور اشتہارات کے سلسلہ میں بذریعہ چیک ادائگی فرماتے ہیں، وہ از راہِ کرم چیکوں پر مندرجہ ذیل عنوان تحریر فرمایا کریں:

Quarterly Al-Aqreba, Islamabad

ڈاکٹر راحت سلطانہ (حیدرآباد۔دکن۔انڈیا)

خواتین کی صحافتی خدمات

(بیسویں صدی کے ربع اوّل میں)

صنفِ نازک کو امّ القصص کہا گیا ہے۔ وہ خود قصہ بھی ہوتی ہیں اور قصہ کا موضوع بھی۔ عورت کا وجود قدیم زمانے سے نہ صرف تصویر کائنات میں رنگ بھرنے کے لیے ہے بلکہ اس کی دلکشی مسائل سے لبریز بھی ہے۔ ہر دور میں جہاں عورت کی مخالفت میں آواز اٹھائی گئی ہے وہیں اس کی حمایت بھی کی گئی ہے۔ عورت کی داستاں جتنی قدیم ہے اتنی ہی طویل بھی ہے۔ ہندو مذہب میں عورت کو خانگی زندگی کا مرکز و سماجی تہذیب کی بنیاد کہا گیا ہے وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اس سے زیادہ گنہ گار کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں جہاں لڑکیوں کو دفن کرنے کی مخالفت میں باقاعدہ سورۃ نازل ہوئی تو وہیں عورت کو خاوند کے انتخاب سے لے کر اولاد کی تعلیم وتربیت تک آزادی بھی دی گئی ہے۔ ہندوستان کی ترقی میں عورت کا کردار برائے نام ہے لیکن اس کی ذمے داری صرف عورتوں پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ہندوستانی سماج اس کا ذمے دار ہے جس نے عورتوں کو تعلیم سے محروم کر دیا۔ بچپن میں شادی کے بندھن میں باندھ دیا اور اسے ہر طرح کی ترقی کے سلسلے میں مردوں کا زیرِ نگیں کر دیا گویا اسے طرح طرح کی بندشوں میں جکڑ دیا گیا۔ جس سے آزادی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہندوستانی سماج نے انگریزوں کے زیرِ اثر سماجی اور سائنسی ترقی کی ایک جست لگائی۔ چھاپہ خانہ کے فروغ نے ہندوستان میں سماجی اور سیاسی بیداری میں زبردست خدمات انجام دیں۔ پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں ہندوستان میں مختلف زبانوں میں اخبار خاصی تعداد میں نکلنے لگے، عورتوں کو بھی ۱۸۵۷ء کی ناکامی نے جمود سے حرکت کی طرف راغب کیا۔ یہی سبب ہے کہ عورتوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع میسّر آئے اور مردوں کے قدم سے قدم ملا کر عورتیں بھی میدانِ عمل میں نکل پڑیں۔

ہندوستان کے تقریباً تمام صوبوں کی عورتوں میں تعلیم کا شوق بڑھنے لگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی تعلیم کے حصول میں بھی دلچسپی لینے لگیں۔ ۱۸۸۳ء میں پہلی بار ہندوستانی عورت نے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی ۱۸۹۳ء میں پہلی بار ہندوستانی خاتون ڈاکٹری کی تعلیم کے سلسلے میں آکسفورڈ گئی۔ ملک کی آزادی کے سلسلے میں عورتوں نے مردوں کے دوش بدوش میدان عمل میں قدم جمایا۔ جہاں تک شعروادب کی تخلیق کا تعلق ہے۔ عورت اور مرد کی تخصیص نہیں ہونی چاہیے۔ بقول نوبل انعام یافتہ نداین گورڈیمر:

"جب لکھنے والوں کی بنیادی صلاحیت کا سوال آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ کوئی لکھنے والا عورت یا مرد نہیں ہوتا یعنی لکھنے والے کا وجود (Androgynous) ہوتا ہے یعنی ایسا وجود جس کی دو جنسیں ہوتی ہیں۔ مرد اور ایک عورت۔" (اردو ادب کو خواتین کی دین۔ ص ۶)"

اس میں شک نہیں کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں نے تعلیم' تدریس' اور تصنیف اور تالیف کے میدان میں پہلے قدم رکھا اور اس میدان میں ترقی وارتقاء کی کئی منزلیں طے کرلیں۔ عورتوں کو زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کا موقع بہت بعد میں ملا لیکن خواتین کو تعلیم حاصل کرنے کے راستے جب ہموار ہو گئے تو اس صنف لطیف نے اپنی ہنرمندی، فنکاری، اپنے تجربات زندگی، جذبات اور احساسات کا بے پناہ مظاہرہ کیا۔

ایک عرصے تک ماہ لقا بائی چندا کو اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ سمجھا جاتا تھا لیکن بعد میں لطف النساء امتیاز نے چندا سے صرف ایک سال قبل اپنا دیوان مرتب کر کے اس سے یہ اعزاز چھین لیا۔ امتیاز سے قبل بھی خواتین میں شعر گوئی کا رجحان موجود تھا چنانچہ جدید تحقیق کی روشنی میں اردو کی پہلی معلوم شاعرہ بی بی فتح ملک زوجہ محترمہ قاضی محمود دریائی (۹۴۱ھ) ہیں۔ جہاں تک اردو میں نثر نگاری کا تعلق ہے خواتین نے غالباً افسانہ نگاری کی طرف پہلے توجہ کی اور پھر اس کے بعد ناول نویسی، ڈرامہ نگاری اور غیر داستانوی ادب کی طرف متوجہ ہوئیں۔ بیسویں صدی کے ربع

اول میں خواتین میں باقاعدہ طور پر افسانہ نگاری کا رجحان مقبول ہوا۔

یوں تو بیسویں صدی کے اوائل میں عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے مسائل کے موضوع سے متعلق اور بھی رسائل جیسے "خاتون" علی گڑھ (۱۹۰۴ء) "شیر مادر" لاہور (۱۹۰۵ء) "عصمت" لاہور۔ دہلی (۱۹۰۱ء)، "تہذیب نسواں" لاہور (۱۸۹۸ء)، "شریف بی بی" لاہور (۱۹۰۹ء)، "الحجاب" آگرہ (۱۹۰۹ء)، "احمدی خاتون" پنجاب (۱۹۱۲ء)، "سہیلی" دہلی (۱۹۱۵ء)، "ہمجولی" امروہہ (۱۹۱۹ء) "ہمجولی نسائی" دہلی (۱۹۱۹ء) نکلتے تھے۔ جن کے مدیران مرد تھے۔ یہاں ہم اپنے موضوع یعنی خاتون مدیران رسائل سے ہی سروکار رکھیں گے۔

جہاں تک صحافت کے میدان میں خواتین کی کارگزاریوں کا تعلق ہے اس کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہوا۔ چنانچہ جس خاتون نے اردو میں سب سے پہلا رسالہ جاری کیا اس کا نام "بی اللہدی زینت" ہے جس نے ۱۹۰۲ء میں مسجد تہور خاں دہلی سے ماہنامہ "شمس النہار" جاری کیا۔ نزاکت ☆ صاحبہ کو اردو کی پہلی خاتون مدیر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس سے پہلے کسی خاتون نے کوئی رسالہ یا اخبار جاری نہیں کیا تھا۔ بقول انیس دہلوی:

"شمس النہار میں تحریر کئے ہوئے مدیرہ کے ہر حرف سے نزاکت ہی نزاکت ٹپکتی تھی۔ مجسم نزاکت تھیں۔"

"شمس النہار" کا زر سالانہ چار روپے تھا اور یہ خوب بکتا بھی تھا۔

خاتون ایڈیٹر کا دوسرا رسالہ مئی ۱۹۰۷ء میں محترمہ خاموش نے "پردہ نشین" کے نام سے عزیزی پریس آگرہ سے جاری کیا۔ ۴۴ صفحات پر مشتمل اس ماہانہ رسالے میں زیادہ تر عورتوں کے مضامین ہی شائع ہوتے تھے۔ شاذ و نادر ہی عورتوں کے مسائل سے متعلق مردوں کے مضامین

☆ قبل ازیں "بی اللہدی زینت" نام آجانے کے بعد "نزاکت صاحبہ" دوسرا نام آنے پر پہلی خاتون مدیر کے بارے میں ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال ہم انیس دہلوی کے قول پر انحصار کرتے ہوئے موخر الذکر نام ہی پر تکیہ کرتے ہیں۔ (ادارہ)

چھپتے تھے۔ "پردہ نشین" کے سرورق پر مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی کا درج ذیل قطعہ شائع ہوا کرتا تھا۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جوان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

فروری ۱۹۰۹ء میں محترمہ سلطان جہاں بیگم چنگیزی نے "دائی" کے عنوان سے ۳۰ صفحات پر مشتمل ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اس رسالے کا سالانہ چندہ دو روپے تھا۔ اسی طرح اکتوبر کے مہینے میں دہلی سے ایک ماہوار رسالہ "اُستانی" کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ اس کی ایڈیٹر محترمہ خواجہ لیلیٰ بانو تھیں۔ "اُستانی" کا زرِ سالانہ تین روپے تھا۔ اس میں انتہائی سادہ اور سلیس زبان میں عورتوں کے لیے معلوماتی اور اصلاحی مضامین چھپتے تھے۔ اس رسالے کے مضامین بہت دلچسپ اور کارآمد ہوتے تھے۔ طباعت و کتابت وغیرہ بہت اچھی تھی۔ بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں حیدرآباد دکن سے ایک نسوانی رسالہ "النساء" کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا اور اڑتالیس صفحات پر مشتمل اس رسالے کی مدیر صغرا بیگم ہمایوں مرزا تھیں۔ اس رسالے کا زرِ سالانہ تین روپے تھا۔

صغرا بیگم صاحبہ کا شمار حیدرآباد کی مشہور و معروف صاحبِ قلم خواتین میں ہوتا تھا۔ وہ بہ یک وقت شاعرہ بھی تھیں اور نثر نگار بھی۔ شاعری میں وہ حیا تخلص کرتی تھیں۔ رسالے "النساء" کا سنہ اجراء ڈاکٹر طیب انصاری نے "حیدرآباد میں اردو صحافت" میں اور مولوی انیس دہلوی نے "اردو ادب کو خواتین کی دین میں" ۱۹۱۹ء۔ اس کے علاوہ "باغِ دلکشا" کے مؤلف جناب صمصام شیرازی نے اس رسالے کے جاری ہونے کا سال ۱۹۲۸ء لکھا ہے۔ یہ تمام بیانات غلط ہیں۔ خود صغرا ہمایوں مرزا نے "النساء" کے پہلے شمارے میں اس کی تاریخ اجراء پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اس کی پیدائش کا دن یکم شعبان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۱ اپریل ۱۹۲۰ء ہے۔ آج ہم النساء کا پہلا نمبر ناظرات اور ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ہماری بہنیں بھی اگر اس میں مضامین لکھنے میں دلچسپی لیں اور اس کو تبادلۂ خیالات کا ذریعہ سمجھیں تو ہم جانیں گے کہ ہماری کوشش و محنت بارآور ہوئی۔"

"النساء" ہجری مہینے کی پہلی تاریخ کو مطبع نظام حیدرآباد دکن میں طبع ہو جاتا تھا۔ ہر شمارے کی قیمت ۵ آنے تھی۔ "النساء" کے پانچ درج ذیل اغراض و مقاصد بتائے گئے ہیں۔

(۱) صلاح خیالات نسواں (۲) خواتین دکن میں لکھنے اور پڑھنے کو عام کرنا (۳) خواتین دکن کو مضمون نگاری کا شوق دلانا (۴) مسلم مستورات کی گری ہوئی حالت کو ابھارنا (۵) مستورات کے حقوق کا تحفظ اور ان کی حمایت اور وکالت کرنا۔

"النساء" کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حبیب انصاری مرحوم نے لکھا ہے:

"لڑکیوں میں لکھنے کی عادت پیدا کرنے اور ادب کی طرف ترغیب دلانے کے لیے بہترین مضامین پر سونے اور چاندی کے تمغے دینے کا طریقہ رائج کیا گیا اور طے پایا کہ سال میں جن کے مضامین عمدہ ہوں گے ان کو میڈل دیا جائے گا۔ مضامین، قصوں کے پیرائے میں یا تاریخی یا نامور خواتین کے حالات پر مشتمل ہوں"

"النساء کی اشاعت کے بعد صغرا ہمایوں مرزا کی ادارت میں لاہور سے ایک اور رسالہ "زیب النساء" کئی سال تک شائع ہوتا رہا لیکن اس کا اجراء کب ہوا اور یہ کب تک شائع ہوتا رہا اس کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔

حیدرآباد دکن سے محترمہ مریم بیگم کی ادارت میں "خادمہ" کے نام سے ۱۹۲۲ء میں ایک رسالہ ظہور پذیر ہوا۔ یہ ۲۲ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ "خادمہ" میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور عورتوں کی خانگی زندگی سے متعلق اوسط درجے کے مضامین چھپتے تھے۔ بیسویں صدی کے ربع اول کے آخر یعنی ۱۹۲۵ء میں ملتان سے جاری ہونے والا کسی خاتون مدیرہ کا رسالہ "سرتاج" ہے جو ملتان سے ہر ماہ نکلتا تھا۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل اس رسالے کا زر سالانہ چار روپے تھا "سرتاج" کی مدیرہ محترمہ قمر جہاں بیگم صاحبہ تھیں۔ اس ماہنامہ میں خواتین سے متعلق بہت مفید مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ دو سال تک برابر نکلتا رہا لیکن ۱۹۲۷ء میں چند مشکلات کی وجہ سے اس کا دفتر ملتان سے لاہور چلا گیا اور سر محمد شفیع کی سرپرستی اور نگرانی میں ایک بار پھر یہ آب و تاب اور توانائی کے

ساتھ سیدہ امتیاز فاطمہ بیگم کی ادارت میں منظر عام پر آیا۔ چھبیس صفحے کے اس رسالے کی سالانہ خریداری ڈھائی روپے مقرر ہوئی۔ بقول انیس دہلوی:

"اردو میں اس وقت معیار کے اعتبار سے بالعموم لڑکیوں اور کم علم مستورات کے لیے نامور رسالے موجود تھے۔ مگر ضرورت تھی ایسے رسالے کی جو لڑکیوں اور کم علم مستورات کی دلچسپی بڑھانے کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پختہ خیال خواتین کے مذاق سلیم کی بھی تشفی کر سکے۔ اس غرض کو مد نظر رکھتے ہوئے اعلیٰ پیمانے کا ماہنامہ "سرتاج" جاری کیا گیا تھا جو علمی معاشرتی مضامین کا ایک نادر مرقع تھا۔ (اردو ادب کو خواتین کی دین۔ ص ۲۶۳)

خاتون مدیران رسائل کے اس ۲۵ سالہ جائزے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عورتوں نے جہاں اردو کی مختلف اصناف میں اپنے وجود کو منوایا ہے وہیں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور خواتین کے مختلف النوع مسائل کی ترجمانی اور ان کے حل کے سلسلے میں قابل قدر صحافتی خدمات انجام دی ہیں۔

******

افتخار عارف

روس میں فیض صدی کی خصوصی کانفرنس ☆

فیض صدی تقریبات کے سلسلے میں ساری دنیا فیض کو یاد کر رہی ہے اور اپنے اپنے طور پر ان کو خراج عقیدت پیش کر رہی ہے۔ ماسکو اور فیض دونوں کے تعلق کے حوالے سے ایک عہد استوار اور ایک پیمان مسلسل کا خیال آتا ہے۔ ماسکو فیض کو عزیز تھا اور فیض ماسکو کو محبوب تھے۔ بقول فیض:

"یہ شہر اور شہر کے رہنے والے کئی وجہ سے ہم کو عزیز ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہاں بہت دوستی کی ہے، بہت محبتیں کی ہیں، بہت شعر لکھے ہیں، بہت دعوتیں کھائی ہیں اور لوگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور اس کے علاوہ ہم نے زندگی میں جو کچھ اپنا نظریہ اختیار کیا اس میں بھی بہت سا دخل یہیں کے دوستوں کا ہے۔ اس شہر کے رہنے والوں نے جو دو چیزیں سکھائی ہیں لوگوں کو، اپنے لوگوں کو بھی اور دوسرے لوگوں کو بھی، یک امن سے محبت کرنا اور جنگ کرنا لیکن جنگ کے لیے نہیں امن کے لیے جنگ کرنا۔"

☆ فیض صدی کی بین الاقوامی تقریبات کے سلسلے میں پاکستان سوسائٹی ماسکو اور رشین اکیڈمی آف لیٹرز کے تحت ۲۲-۲۴ اپریل ۲۰۱۱ء روس میں ایک سہ روزہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں روسی سکالرز اور روس میں مقیم پاکستانی کمیونٹی کے اراکین کے علاوہ پاکستان اور ازبکستان کے دانشوروں نے شرکت کی۔ پاکستانی وفد میں اسلام آباد سے افتخار عارف اور کشور ناہید، لاہور سے فیض احمد فیض مرحوم کی صاحبزادیوں سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی اور ای اے رحمان جب کہ کراچی سے زاہدہ حنا اور راحت سعید نے شرکت کی۔ تاش مرزا ازبکستان سے اس کانفرنس میں شامل تھے۔ روسی دانشوروں کی نمائندگی ڈاکٹر وسیع لیوا اور عامر فاروقی کر رہے تھے۔ کانفرنس میں شریک مندوبین نے فیض کی شخصیت اور فن کے حوالے سے مقالے پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کا مختلف جہتوں سے احاطہ کیا۔ اس موقع پر فیض پر میرہ ہاشمی کی تیار کردہ ڈاکومنٹری کے علاوہ فیض صاحب کی پیش کردہ نظم "جاگو ہوا سویرا" بھی نمائش کی گئی جب کہ روسی اور پاکستانی طلبہ نے کلام فیض سنایا۔ (صاحب مضمون)
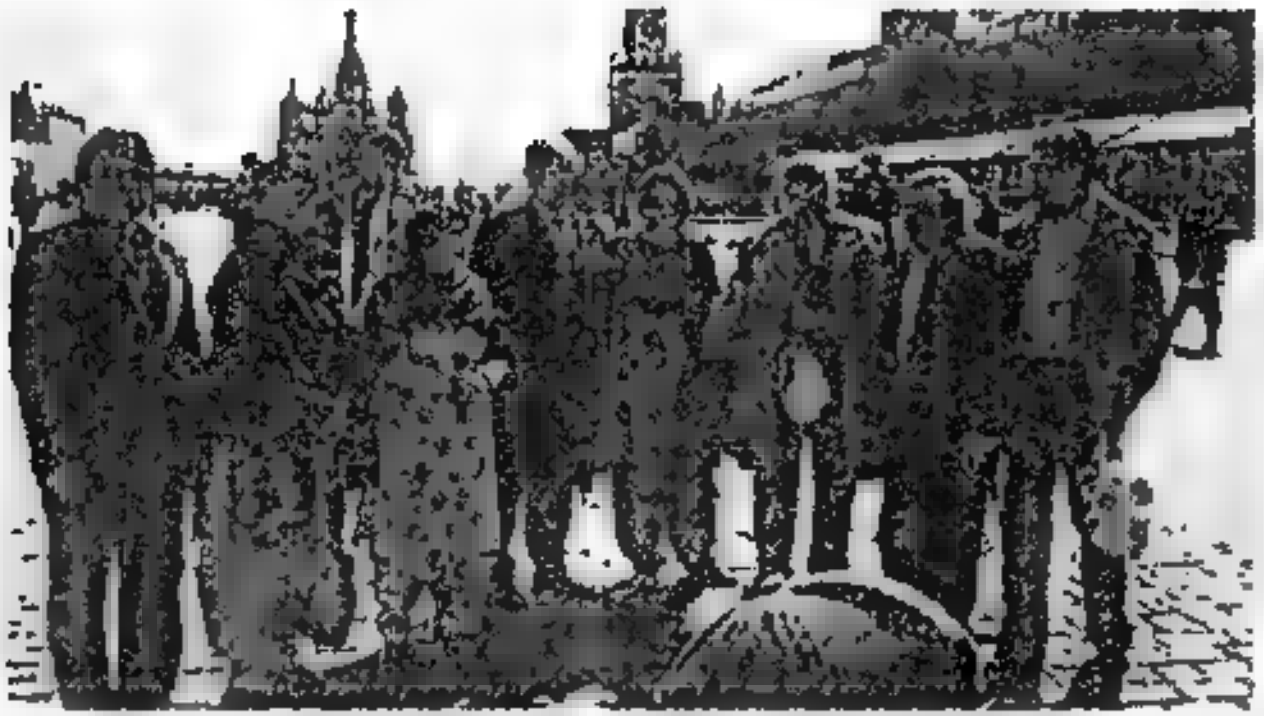
پاکستانی وفد کے ارکین ماسکو میں

فیض نے ماسکو میں قیام کے دوران آتے جاتے اردو کی بے مثال ور لازوال نظمیں لکھی ہیں۔ آغازِ کلام ہی میں ایک ایسی نظم ۔"پاس رہو" ۱۹۶۳ء کے اوائل میں لکھی گئی ایک بہترین مثال ہے:

تم مرے پاس رہو
مرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہم مشک لیے، نوحۂ الماس لیے
بین کرتی ہوئی ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں

آس لیے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قلقل مے
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو!

یہ ۶۳ء کی ایک شام کو ماسکو کے ایک ہوٹل میں لکھی ہوئی یک اور نظم ہے جسے بجا طور پر اردو منظر

نگاری کا ایک شاہکار قرار دیا گیا ہے:

رہگذر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا، آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا، آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب

میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ
دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
تم نے کہا "آہستہ"
چاند نے جھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

پچھلی بار میں گلاس نوسٹ اور پریس ٹرائیکا کے آخری زمانے میں، فیض کے دوست جن سے مجھے بھی نیاز مندی کا شرف حاصل تھا چنگیز اتماتوف کی دعوت پر ماسکو آیا تھا۔ سوویت یونین بدل رہا تھا، مشرقی یورپ کی دنیا بدل رہی تھی، میں خود کو بہت بے بس اور بہت تنہا محسوس کر رہا تھا۔ نئی دنیا کے خواب کے انہدام کے بارے میں میں نے کچھ لکھا بھی تھا۔ لکھنؤ کے عہد طالب علمی میں سجاد ظہیر، مجاز، سردار جعفری، مخدوم، جذبی، مجروح، ڈاکٹر رشید جہاں سے زیادہ فیض کے حوالے سے جس آدرش اور جن شخصیتوں کا تعلق قائم ہوا تھا وہ موضوع گفتگو بنے ہوئے تھے اور اب جب ہم فیض کو Celebrate کر رہے ہیں، فیض کا آدرش اور خود فیض ایک عجیب وغریب صورت حال سے دوچار ہیں۔ ہم بایزید کے کردار کی رفعت وعظمت پر بات کرتے ہیں مگر یزید کے دسترخوان پر حاضری کے لیے تن، من، دھن سب کچھ وار دینے پر آمادہ ہیں۔

خدا ماسکو کو قائم رکھے کہ یہاں تاریخ کے عظیم انقلاب کے خواب کی تعبیر نظر آتی ہے۔ بہت یاد آتے ہیں رسول حمزہ توف، پروفیسر سخاچوف، چنگیز اتماتوف، مریم سلگانک، الیکسی سرکوف اور ریما کازاکووا جنھوں نے فیض سے محبت کی اور ان کے بارے میں ایسی تحریریں لکھیں۔ میں نے

فیض کے انتقال کے بعد لندن کے اردو مرکز میں یادگاری لیکچرز کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں پاک و ہند کے جہان دانش کے نمائندہ افراد کے علاوہ سوویت یونین سے رسول حمزہ توف، ریما کا زاکووا اور چنگیز اتماتوف نے بھی شرکت کی۔

ابتدائیے کے بعد ایک مختصر سے تاثراتی مضمون کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ فیض احمد فیض بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو کے سب سے محبوب اور مشہور شاعر کی حیثیت سے دنیا بھر کے ادبی اور عوامی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک لے جنڈ legend، ایک قابل رشک روایت کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ فیض کی دل کو چھو لینے والی شاعری اور من موہنی شخصیت عوام میں بھی محبوب تھی اور ادبی حلقوں میں بھی فیض استاد تھے، مدیر تھے، ترقی پسند تحریک کے رہنما تھے، فلم پروڈیوسر تھے مگر فیض بنیادی طور پر شاعر تھے۔ اول و آخر تمام و کمال شاعر۔ دانش افروز، ترقی پسند شاعر۔ انسان دوست، انسانیت کے خیر خواہ۔ ترقی پسند تحریک کی ترجمانی ہو یا صحافت اور ثقافت کے کوچوں میں قیام کا زمانہ۔ قید و بند کی صعوبتیں ہوں یا جلاوطنی کا دور، فیض کی شاعری ہر جگہ ہر زمانے میں ان کی ترقی پسند انقلابی فکر کی تصدیق کرتی نظر آتی ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں ادب و فنون اور تہذیب و ثقافت کی سب سے موثر اور سب سے مستند شخصیت کے طور پر عوام و خواص کے تمام حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شاعری میں فیض ترقی پسند فکر کے سب سے معتبر اور سب سے محبوب ترجمان کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ فکر و خیال، جذبہ و احساس اور نغمہ و آہنگ کا جیسا حسین امتزاج اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے اس کے سبب فیض کو عالمی سطح کے عظیم انقلابی شعرا لورکا، پابلو نرودا، ناظم حکمت اور مایا کوفسکی کی صف میں جگہ دی جاتی ہے۔ (پاکستانی زبانوں کے ہم عصر شعرا میں شیخ ایاز، تنویر عباسی، استاد دامن، غنی خان، اجمل خٹک، گل خان نصیر اور جان باز جتوئی کا شمار بھی ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔)

بیسویں صدی تاریخی اعتبار سے بڑی تحریکوں اور انقلابوں کی صدی ہے۔ اس کے آغاز میں

ایک طرف کچھ اہلِ قلم ورجینیا وولف، ڈی ایچ لارنس، ایذرا پاؤنڈ اور ان کے ساتھی ماڈرن ازم سے مکتبہ فکر کے آغاز کا اعلان کر رہے تھے اور دوسری طرف گورکی، مایا کافسکی، لورکا اور ان کے ہم خیال اہلِ قلم تھے جنھوں نے یہ سوال اُٹھا رکھا تھا کہ تاریخ کے اس نازک اور فیصلہ کن موڑ پر اہلِ قلم کس کے ساتھ ہیں اور جب عالمی سطح پر لکھنے والوں کا ایک ایسا گروہ سامنے آیا جس نے محروم اور مظلوم اور مجبور طبقوں کی زندگیوں میں تبدیلی کو اپنا مقصود ٹھہرایا اور قلم کو خلقِ خدا کی امانت سمجھ کر ذاتی رنج و غم اور دکھ درد سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اجتماعی مسائل کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑا۔ فیض نے اپنے فلسفہ زندگی کے جوہر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کی ضرورت ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔"

فیض کا یہ بھی خیال تھا

"لکھنے والا اپنے ملک اور اپنے عوام کا وفادار ہوتا ہے اور وہ عوام کا دوست اور ان کا دانشور اور رہنما ہوتا ہے۔ اس کا کام ہے عوام کو جہالت، توہمات، روایات اور تعصبات کے اندھیرے سے نکالنا اور علم و دانش کی روشنی کی طرف لے جانا اور اس کا کام ہے عوام کو جبر سے آزادی کی طرف اور مایوسی سے اُمید کی طرف لے جانا"۔

فیض عالمِ انسانیت کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری دوامی آفاقی انسانی قدروں کی ترجمان تھی مگر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی تخلیق کار مقامی ہوئے بغیر آفاقی نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی زمین سے اور اپنے لوگوں سے جڑے ہوئے تھے فیض ایک جانب دار شاعر تھے۔ ان کی جانب داری دنیا کے مجبور اور محروم طبقوں کے لیے تھی، آزادی، امن اور مساوات اور جمہوریت کے اصولوں کے لیے تھی۔ قیامِ پاکستان سے لے کر اپنی وفات تک ہماری تاریخ کے ہر اہم واقعے پر فیض نے اپنا شاعرانہ تبصرہ ضرور کیا۔ آزادی کا مرحلہ ہو یا آزادیِ اظہار پر لگنے والی قدغنوں کی صورتِ حال مارشل لاء عہد میں جبر و تشدد کی صعوبتیں ہوں یا قید و بند کے مرحلے، مشرقی پاکستان کا المیہ ہو یا خلقِ خدا پر ہونے والے مظالم کی داستان، جلاوطنی کی منزلیں ہوں یا اپنے آدرشی ممکنوں کے بتدریج

زوال اور انہدام کے اندیشے ان سب کا بیان فیض کی شاعری میں موجود ہے۔ فیض نے جیل خانے میں جو شاعری کی ہے ساری دنیا کی حبسیہ شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بقول فیض جیل خانہ میری شاعری کا بہت زرخیز دور تھا جیل کا زمانہ ایسا تھا جیسے پھر سے عشق کر لیا جائے۔ شاعری سے عشق۔ عشق میں جیسے خود بخود شعر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جیل خانے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ خود اختیار کردہ جلاوطنی کی شاعری بھی کمال کی ہے۔ خاص طور پر ان کے آخری شعری مجموعے "مرے دل مرے مسافر" کی شاعری

فیض کے نظریہ ادب میں قلم کو خلق خدا کی امانت سمجھا جاتا ہے اور ان پر گزرنے والے ہر لمحے کی ترجمانی اس کا وظیفہ قرار پاتا ہے۔ ایک دوسرا مکتبۂ فکر بھی ہے جو جمالیات کے نام پر لمحۂ موجود کا انکار کرتے ہوئے مستقبل کی دوامی جہتوں پر زور دیتا ہے مگر مجھے ایلیا اہرن برگ کی اس بات میں زیدہ وزن نظر آتا ہے کہ ایک ادیب کے لیے صرف یہ ضروری نہیں کہ وہ ایسا ادب تخلیق کرے جو آنے والے زمانوں کے لیے مستقبل کی صدیوں کے لیے ہو۔ اُسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہیے جو صرف ایک لمحے کے لیے ہو۔ گر اس ایک لمحے میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

فیض سے جب ان کے عقیدے کے بارے میں پوچھا گیا تو اُن کا جواب تھا کہ:

''میرا مذہب وہ ہے جو مولانا رُومیؒ کا ہے۔'' جب اُن سے مولانا رُومیؒ کے مذہب کی وضاحت کرنے کو کہا گیا تو بولے کہ ''اُن کا مذہب وہی تھا جو میرا ہے'' پھر اُنھوں نے یہ بھی جتایا کہ کس طرح واعظانِ کرام مولانا رُومی تک پہنچے اور اُن سے ان کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا، اُن میں سے ایک نے رُومیؒ سے پوچھا'' آپ کا تعلق کس فرقے سے ہے'' تو رُومیؒ نے جواب دیا کہ ''تمام ۷۲ فرقوں سے ان کے پلے کچھ نہ پڑا، لیکن ان میں سے ایک نے کہا'' پھر تو آپ مرتد اور کافر ٹھہرے'' تو مولانا رُومیؒ نے برجستہ جواب دیا کہ'' اگر آپ اسی میں خوش ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔''

فیض کا ایمان تھا کہ امن سے نہ صرف محبت کرنی چاہیے بلکہ اس کے لیے جد و جہد بھی کرنی چاہیے۔ امن کی خاطر مستقل اور غیر مصالحانہ جد و جہد کرنا ضروری ہے۔ یہ جد و جہد ہر ایمان دار انسان کا فریضہ ہے۔ میں اپنے معروضات فیض کے الفاظ پر ختم کروں گا۔

"مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا دوستی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی۔

خلل پذیر بود ہر بنا کی می بینی   مگر بنائے محبت کی خالی از خلل است"

۱۹۸۶ء میں "شاعر کی خاموشی" کے عنوان سے روسی زبان میں انھوں نے اپنی ایک نظم کا انگریزی ترجمہ سنایا:

O Faiz,
you were a trumpet to my heart
Whose silent calls were clearly, clearly heard !
Although a poor disciple of your art
I do recall how fine it always felt
to talk to you without saying a word
O noisy speeches, dull and long they roar,
how furiously the speakers fan the wind
not so with you, o faiz !- you were akin
to all of us, Even to utter a word
there was no need your silence meant much more.
(۱۴ -A)

*****

ہے کہ لوگ اپنی ذاتی شہرت کے لیے میڈیا کی طرف جاتے ہیں۔ یہ میڈیا سے شعر و ادب کی طرف آئے۔ اکیڈمی ادبیات ہو یا مقتدرہ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس ملک کو دیا ہے لیا بہت کم۔ کسر نفسی، اخلاق و اخلاص ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہیں انھوں نے ہر شخص کی عزت کی ہے۔ لہٰذا ہر شخص کا فرض ہے کہ ان کی عزت کرے۔

افتخار عارف صاحب کے مختصر تعارف کے بعد منصور عاقل صاحب نے فرداً فرداً باقی معزز مہمانوں کا تعارف نشستوں کی ترتیب سے کرایا۔ شرکائے محفل میں شامل تھے جناب جسٹس شاہد صدیقی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کے فرزند اور سابق سفیر جناب ماہر شادانی۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران صدر شعبہ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔ بریگیڈیئر اقبال شفیع صاحب صدر سرسید میموریل سوسائٹی۔ جناب حبیب الوہاب الخیری معروف سماجی و قانون داں۔ جناب اصغر حسین بزداری سینئر وکیل۔ جناب طارق محمود خاں صاحب سابق چیئرمین سی۔ ڈی۔ اے اور ایڈیشنل چیف سیکرٹری آزاد کشمیر۔ جناب عبدالستار نسیم ایگزیکٹیو وائس پریذیڈنٹ پی۔ ٹی۔ سی۔ ایل۔ انجینئر سلیم زاہد صدیقی معروف شاعر و خاکہ نگار۔ جناب شریف فاروق سینئر صحافی، ادیب اور مصنف۔ جناب سید محمد سلمان مذہبی سکالر و سابق مینیجنگ ڈائریکٹر پاکستان پوسٹ فاؤنڈیشن۔ جناب اختر وقار عظیم معروف دانشور اور الیکٹرونک میڈیا کی اہم شخصیت۔

جناب طاہر فاروق مدیر روزنامہ جہاد اور روزنامہ اتحاد (پشاور۔ اسلام آباد) جناب سید نظر علی زیدی (ملیگ) رکن ایگزیکٹیو کمیٹی الاقرباء فاؤنڈیشن اور جناب سید محمد حسن زیدی معروف نعت نگار۔ سابق سکریٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن و سابق ایڈیشنل سکریٹری وزارت پورٹس، اینڈ شپنگ حکومت پاکستان۔ راقم الحروف کے علاوہ جو خواتین شریک محفل تھیں ان کے اسمائے گرامی ہیں۔ ڈاکٹر ربیعہ طارق خان۔ محترمہ راشدہ نظر زیدی۔ محترمہ شہلا احمد۔ محترمہ شہلا حسن زیدی اور میزبان خاتون محترمہ سیدہ ناہید منصور

آخر میں افتخار عارف صاحب سے گزارش کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں انہوں نے اپنی کچھ خوبصورت اور نمائندہ غزلوں اور نظموں سے حاضرین محفل کو محظوظ کیا۔ چند اشعار:

ہم اپنے رفتگان کو یاد رکھنا چاہتے ہیں   دلوں کو درد سے آباد رکھنا چاہتے ہیں

کیسے بے مہر ہیں اس شہر دل آزار کے لوگ   موج خوں سر سے گزر جاتی ہے تب پوچھتے ہیں

اس بار بھی دنیا نے ہدف ہم کو بنایا   اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے

کہانی آپ الجھی ہے یا الجھائی گئی ہے   یہ عقدہ تب کھلے گا جب تماشہ ختم ہوگا

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات   سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں

سخن حق کو فضیلت نہیں ملنے والی   صبر پر داد شجاعت نہیں ملنے والی

اور پھر حاضرین کی بھرپور فرمائش پر نظم بارھواں کھلاڑی سنی گئی۔۔۔ دل تو چاہتا تھا دیر سے دیر سے گزرتی ہوئی رات کے اسی پہر میں ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لہجے میں پڑھے جانے والے اشعار بہ زبان شاعر کا سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مگر مسز ناہید منصور کی آواز اور انواع و اقسام کے کھانوں کی مہک مسحور کن اشعار کے حصار میں اہل محفل کو ڈرائنگ روم سے ڈائننگ روم کی طرف لے آئی اور یوں یہ محفل اختتام کو پہنچی۔

جناب افتخار عارف کا مکتوب سید منصور عاقل کے نام

(مقتدرہ قومی زبان کی صدر نشینی سے سبکدوشی پر)

اب جب کہ میں مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین کی حیثیت سے سبکدوش ہو رہا ہوں، ضروری سمجھتا ہوں کہ ان دوستوں اور کرم فرماؤں، مہربانوں اور مخلصوں کو ضرور مطلع کر دوں جو میرے لیے ہمیشہ قوت اور طمانیت کا سبب بنتے رہے ہیں۔

اللہ کریم کی بے پایاں مرحمت وعطا، بے حساب انعام اور کرم کہ اس نے بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ پاکستان ٹیلی وژن کا عہد، اُردو مرکز کا دور، اکادمی ادبیات پاکستان کے دن اور مقتدرہ قومی زبان کا زمانہ جہاں بھی خدمات سرانجام دیں مجھے تہذیب وثقافت اور زبان وادب کے شعبے میں متواتر اپنے ہم وطنوں کی خدمت کا موقع میسر آیا اور پروردگار کا ہزار شکر کہ میں نے اپنی بساط بھر جو بھی کام کیا سارے ملک میں اس کی حوصلہ افزائی ہوئی، اس کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا۔ سندھ ہو یا پنجاب، خیبر پختونخوا اور بلوچستان ہو یا آزاد کشمیر وطن عزیز کے گوشے گوشے میں جہان دانش کے شعبے ہی میں نہیں عام زندگی میں بھی لوگوں نے بہت قدر افزائی کی اور کلمات خیر سے نوازا۔ بہت مشکل زمانوں میں بھی میری اس بات کی توثیق ہوئی کہ پاکستانی عوام کشادہ دلی کے ساتھ محنت و دیانت سے کام کرنے والوں کو پہچانتے بھی ہیں اور ان کو بہت عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔

اللہ کریم ہمیں نعمتوں کا شکر ادا کرنے اور مہربانیوں کا اعتراف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ سے تعلق کے دوران اگر مجھ سے کوئی کوتاہی یا غلطی ہوئی ہو تو اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ ان شاء اللہ میں پاکستان ہی میں رہوں گا اور حسب توفیق واستعداد، علم وادب کے شعبے میں ہی

امین راحت چغتائی

نعت

کیا غرض کس کو ، ناز گھر مل گیا
اپنے آقا کا ہم کو تو در مل گیا

آرزوئے بہشتِ بریں کیا کریں
جو بھی مانگا خدا سے ادھر مل گیا

اب نگاہوں میں کوئی بھی جچتا نہیں
اُن کے در سے شعورِ نظر مل گیا

ہم کہ بے سمت تھے ، رحمتِ حق ہوئی
راستہ مل گیا ، راہبرؐ مل گیا

زندگی غم سے آزاد ہونے کو ہے
زندگی کو نیا چارہ گر مل گیا

شکر صد شکر ربِ کریم و کرم
زیرِ بیداد تھے ، داد گر مل گیا

اُس کی تقدیر پہ ناز تقدیر کو
راہِ طیبہ کا جس کو سفر مل گیا

اِک تحیّر کا عالم ہے چھایا ہوا
اُنؐ کو دیکھا کہ روتے سحر مل گیا

ہم دردوں کی سوغات لے کے چلے
راستے میں ہمیں نامہ بر مل گیا

ختم ہو کر رہے ، ہجر کے فاصلے
لو مدینے میں راحت کو گھر مل گیا

عبدالستار نعیم

نعت

آپؐ کا نام زباں پہ جو مچلتا جائے
دل میں اک چشمۂ پُر نور اُبلتا جائے

آپؐ کے دم سے درو بام پہ خوشبو اُترے
آپؐ کے ذکر سے گھر بار مہکتا جائے

پھر کڑا وقت پڑا آپؐ کی اُمت پہ حضورؐ
شعلۂ آتشِ نمرود لپکتا جائے

روز اک بات نئی گھر میں جنم لیتی ہے
آسماں روز نئی آب بہ رنگ بدلتا جائے

پھر زمانے کو ہے اک رحمتِ باراں کی طلب
پھر سحابِ کرم اُٹھے کہ برستا جائے

دل بہت تلخی حالات سے آزردہ ہے
اک نظر کیجیے کہ ماحول بدلتا جائے

آج طیبہ سے کوئی موجِ صبا آئی ہے
کیفِ صد رنگ مرے دل میں اُترتا جائے

جب میں سنتا ہوں کہیں لفظِ محمدؐ تو نعیم
خود بخود سوچ کا ماحول نکھرتا جائے

سید محمد حسن زیدی

نعت

دوستو! جب سے کہ میں پیرو حسان ہوا
میری بخشش کا ہر اِک مرحلہ آسان ہوا

اپنی کوتاہی پہ جو شخص پشیمان ہوا
اس گنہگار کا حامی شہِ ذیشان ہوا

ورد کرنے لگا میں نعتِ رسولِ عربی
جب کبھی گردشِ دوراں سے پریشان ہوا

نعت کے صدقے میں جو مانگا خدا سے پایا
پورا ہر ایک مرے قلب کا ارمان ہوا

میرا ایمان ہے جو شرک سے محفوظ رہا
بخشا جائے گا اگر قاریِ قرآن ہوا

میں ثنا خواں ہوں سرکارؐ دو عالم کا حسن
منتظر میرا درِ خلد پہ رضوان ہوا

طارق ہاشمی، ڈیلاس، ٹیکساس (امریکہ)

نعت

یہ جب سنا! مجھے سرکارؐ نے بلایا ہے
میں کھل اٹھا! مجھے سرکارؐ نے بلایا ہے

قضا بھی آئے تو کچھ دیر انتظار کرے
میں چل دیا! مجھے سرکارؐ نے بلایا ہے

یہ جانتا ہوں صبا میں نہیں ہوں اس لائق
یہ سچ بتا! مجھے سرکارؐ نے بلایا ہے؟

اِدھر خطا پہ خطا اور اُدھر عطا ہی عطا
ہے معجزہ! مجھے سرکارؐ نے بلایا ہے

میں اُن کے قدموں میں ہر کہکشاں سے کہوں
میں آگیا! مجھے سرکارؐ نے بلایا ہے

میں اُن کے سامنے کس منہ سے جاؤں گا طارق
مرے خدا! مجھے سرکارؐ نے بلایا ہے

سید حبیب اللہ بخاری

منقبت

(بحضور حضرت خواجہ خدا بخش مہاروی ؒ)

آتا ہوں ترے در پہ میں ہر بار بصد شوق — ہے میری تمنا رہے قائم یہ مرا ذوق

واقف ہوں تری رفعتِ ہستی سے سراسر — تو نجم منور تھا ولایت کے فلک پر

انسان کی توقیر کا باعث تھی تری ذات — عرفانِ حقیقت کی وضاحت تھی تری بات

معبود کی عظمت ترے پیکر میں نہاں تھی — زاہد کی طریقت ترے ظاہر سے عیاں تھی

تھا پیشِ نظر حکمِ پیمبر ؐ ترے ہر دم — راضی تھا تری ذات سے پیغمبرِ اعظم ؐ

تو علم کا مینار تھا حکمت کا دیا تھا — ہر گام پہ انسان کا تو راہنما تھا

اک بات مرے ذہن میں اُبھری ہے کئی بار — کرتا ہوں ادب سے میں ترے سامنے اظہار

اک راز مجھے خواجۂ ذیشان بتا دے — وہ راز جو انسان کو انسان بنا دے

اسلاف کے اوصاف سے محروم ہے ملت — اب قوم کو اسلاف کی عظمت کی دعا دے

محروم ہے گلہائے محبت سے یہ گلشن — پھر لطف و مروت کے حسیں پھول کھلا دے

ہے قابلِ نفریں مرا ظاہر مرا باطن — تو حکمت و تدبیر سے یہ زنگ مٹا دے

ظاہر میں تو باشندے ہیں آزاد وطن کے — قیدی ہیں مگر ذہن اسی عہد کہن کے

قانون ترا ہوگا یہ وعدہ تھا خدا سے — برگشتہ ہیں کس واسطے پیمان وفا سے

میں جانتا ہوں آپ جو فرمائیں گے ہم سے

مذہب تو ہے بنیاد بنا جذبِ بہم سے

امین راحت چغتائی

○

بادِ صبا نے باغ میں کیا کیا کھلائے گل
کلیاں للچا للچا کے کھلیں لہلہائے گل

دیدہ وروں کی اوٹ میں حاسد چھپے رہے
لپکے ہزار ہاتھ جونہی مسکرائے گل

گلچیں تمام فاتحِ سر تفتیش ان دنوں
صحنِ چمن میں خار نمایاں بجائے گل

یوں بھی بسر کرو تو سہی زندگی کبھی
ہنستا بھی جائے داغ بھی دل کے دکھائے گل

کچھ سوچنے کی خو بھی تو زحمت کرو ذرا
بادِ خزاں کی بات ادھوری سنائے گل

یوں زاویے تفکر کے نہ آپس میں مل سکے
ہم آشنائے دل رہے، وہ آشنائے گل

کس کو خبر کہ رات کے پردے میں کیا ہوا
ہنگامِ صبح چاک گریباں دکھائے گل

یہ بھی تو فکر تھی کہ برا مان جائے گا
وہ اور اس کی بزم میں ذکر اڑائے گل

اکھڑی ہوئی ہے باغ کی ایسی ہوا کہ بس
سنتا نہیں ہے کوئی بھی راحت صدائے گل

محشر زیدی

○

آنکھوں میں نیند لا نہ کوئی خواب لے کے آ
اک جاگتی ہوئی شبِ مہتاب لے کے آ

ممکن نہیں ہے ایسے شبِ ہجر کاٹنی
تو عاشقوں کا دیدۂ بے خواب لے کے آ

ہے جس کی آب و تاب گلستاں کی آبرو
میرے لیے وہی گلِ شاداب لے کے آ

اہلِ طلب کی خاک نشینی ہے اصل چیز
کس نے کہا کہ اطلس و کمخواب لے کے آ

طالب ہے تجھ سے معجزوں کی بزمِ زندگی
ہرگز نہ حسرتوں سے بھرے خواب لے کے آ

چومے گی پھر تو صدر نشینی ترے قدم
اک اک ادا کو اپنی ظفریاب لے کے آ

اک چودھویں کا چاند بطرے کے ساتھ ہو
چل اٹھ نگار خانۂ مہتاب لے کے آ

محشر سجی ہوئی ہے ابھی بزمِ کائنات
اٹھ اور کوئی تحفۂ نایاب لے کے آ

سید مشکور حسین یاد

نذرِ غالب

کوئی مجھ سانہ ہدف اُس کو ملا میرے بعد
ہے عجب عالمِ غربت میں قضا میرے بعد

دیکھیں کس ٹھاٹ سے میں چھایا ہوا ہوں خود پر
کوئی بھی میرا نہیں میرے سوا میرے بعد

میں فقط اپنی نہیں غیر کی پہچان بھی ہوں
پوچھتے پھرتے ہیں سب اپنا پتا میرے بعد

سُنتے تھے ہونے کی حد ہے نہ کوئی وقت مگر
جو ہوا سامنے میرے نہ ہوا میرے بعد

ایک ہنگامہ وہم تھا کہ مرے ساتھ گیا
کیسے ہوتا کوئی ہنگامہ بپا میرے بعد

سب خطائیں تو مرے نامۂ اعمال میں ہیں
کوئی کرتا بھی تو کیا کرتا خطا میرے بعد

سانس لینے کے سب آداب سکھاتا جاؤں
کہیں چلنے سے نہ رُک جائے ہوا میرے بعد

فانی ہو کر بھی میں فانی نہیں نکلا مشکور
ڈھونڈتی پھرتی ہے اب خود کو فنا میرے بعد

ڈاکٹر مظہر حامد

O

جذبۂ عشق مرے دل سے جدا کیسے ہو
کوئی کافر بھی بھلا تجھ سے خفا کیسے ہو

اک جھلک ہی ہے ملی منزلِ مقصود مجھے
اس کے احسان کی قیمت بھی ادا کیسے ہو

تُو نے جو زخم دیئے گردشِ دوراں ہم کو
اندمال ان کا اگر ہو تو بھلا کیسے ہو

وہ جو بولے نہ سُنے پھر بھی عبادت اس کی
میرے نزدیک وہ پتھر ہے خدا کیسے ہو

ایک جگنو جو مقیّد ہے حصارِ شب میں
اس لیے رہتا ہے بے چین رہا کیسے ہو

بے وفائی میری فطرت میں نہیں ہے لیکن ہم
یہ لاحق ہے کہ اظہارِ وفا کیسے ہو

ماتمی سی ہے فضا ایسی فضا میں مظہر
دل ہے افسردہ تو پھر نغمہ سرا کیسے ہو

عبدالستار نعیم

ایک قاصد سوئے دل بھجوائیے
زندگی کو موجِ گل ٹھہرائیے

ڈالیے مت آسمانوں پر کمند
اس زمیں پر روشنی پھیلائیے

مانگ کر کھانا نہیں اپنا شعار
پیٹ گھر سے کھائیے، کم کھائیے

کام کتنے ہیں جو باقی ہیں ابھی
استراحت کس لیے فرمائیے!

سر اٹھانا ہی تو ہے اصلِ حیات
یہ نہیں تو شوق سے مر جائیے

وسعتِ قلب و نظر رخصت ہوئی
کس لیے انسان اب کہلائیے

کوئی آنسو، کوئی شبنم، کوئی پھول
زندگی میں کام کچھ کر جائیے

موجۂ ہستی ہے مانندِ حباب
کیوں نعیم اس چیز پر اترائیے

عمر گزری ہے کہ میں اپنا مکاں ڈھونڈتا ہوں
جس میں آباد ہوں انساں وہ جہاں ڈھونڈتا ہوں

مجھ کو بھاتے نہیں تہذیبِ نوی کے اطوار
اپنے اسلاف کے گم گشتہ نشاں ڈھونڈتا ہوں

ہائے یہ آتشِ مجبوری بجاؤں، یارو
کون جانے کہ میں کیوں کوئے بتاں ڈھونڈتا ہوں

وحشتِ جاں ہے مجھے ایسی کہ یہ جی جانتا ہے
میں بیاباں میں ہوں اور گھر کا سماں ڈھونڈتا ہوں

اب اس آسیب سے چھوٹوں تو یہی کافی ہے
کون کہتا ہے کہ میں راحتِ جاں ڈھونڈتا ہوں

میں کہ آزردہ ہوں بے نام سی آوازوں سے
پھر سرِ بزم کوئی حسنِ بیاں ڈھونڈتا ہوں

شہر میں غول درندوں کے در آئے ہیں نعیم
پھر بھی کیا سادہ ہوں میں امن و اماں ڈھونڈتا ہوں

صابر عظیم آبادی

●

اتنا نہ غرور اپنی جوانی پہ کیا کر
شیشے کا بدن اوڑھ کے آہستہ چلا کر

حالات کا شکوہ نہ زمانے سے کیا کر
جب آئے مصیبت تو پریشاں نہ ہوا کر

کیوں چلمن سے بیٹھا ہے غریبوں کو ستا کر
انساں ہے تو انسان کا کردار ادا کر

اس تیرگی غم کا مجھے خوف نہیں ہے
رکھی ہے تری یاد کی قندیل جلا کر

معیار صداقت کا جسے سمجھا تھا میں نے
وہ خوش ہے بہت جھوٹ کی دیوار اٹھا کر

سورج کو نکلنے میں بہت دیر لگے گی
رکھو نہ ابھی گھر کے چراغوں کو بجھا کر

ہوتا ہے اگر شہر کے حالات سے واقف
دیواروں پہ لکھی ہوئی تحریر پڑھا کر

سینے میں کوئی رکھتا نہیں درد بھرا دل
معلوم ہوا آج ترے شہر میں آ کر

آنسو نہ کسی آنکھ کی دہلیز سے ٹپکا
کیا مجھ کو ملا قصۂ غمناک سنا کر

نیرنگیٔ دنیا کی چمک اور دمک میں
سامانِ سفر کون گیا اپنا لٹا کر

ممنون عنایات ہوں اک عمر سے صابر
اچھا نہ کیا آپ نے احسان جتا کر

مضطر اکبرآبادی

○

ہے جو بھی جتن، ربط بڑھانے کے لیے ہے
اُس روٹھنے والے کو منانے کے لیے ہے

ہر چند کہ آمادہ وہ آنے کے لیے ہے
آنا بھی مگر اُس کا تو جانے کے لیے ہے

بے چارے مسافر کو ہے جانا بھی بہت دور
گٹھری بھی ہے بھاری جو اُٹھانے کے لیے ہے

انسان کی بھی آنکھ کا اب ڈھل گیا پانی
اب زہر یہاں پیاس بجھانے کے لیے ہے

جو راکھ بنا دیتی ہے رشتوں کو جلا کر
وہ آگ کہاں دل میں لگانے کے لیے ہے

اک ہاتھ ہے صرف اپنا کہ اب جس پہ ہے تکیہ
تکیہ کہاں موجود سرہانے کے لیے ہے

احباب کہ اغیار ہوں، اپنے کہ پرائے
ہے جو بھی فقط دل کو جلانے کے لیے ہے

جس دل کو ترے ذکر نے مدہوش کیا تھا
آمادہ وہ پھر ہوش میں آنے کے لیے ہے

کیا چیز ہے یہ آئینہ بھی ذات میں اپنی
گہ دیکھنے اور گاہ دکھانے کے لیے ہے

محبوب و محب کے بھی مشاغل ہیں نرالے
اک روٹھنے اور ایک منانے کے لیے ہے

آج اُس سے مجھے فیصلہ کرنا ہے یہ مضطر
تو میرے لیے ہے کہ زمانے کے لیے ہے

شفق ہاشمی

○

ہم کہ اصحابِ کہف ہیں ہمیں کیا حزن و ملال
قیصرِ وقت ہے تو تجھ کو بجا خوفِ زوال

تیری بیداد کو بھی داد رسی کہتے ہیں
ہم جو اس شان سے زندہ ہیں یہ ہے اپنا کمال

تو جو دیتا ہے تو اپنوں کو سوا دیتا ہے
غیر پھیلائے ترے سامنے کیا دستِ سوال

فتنۂ حشر بپا خاک نوردوں کے لیے
کج ادا کوئی، کسی اور کے سر اس کا وبال

شاید اس جیسا جفا جو بھی کوئی اور نہ تھا
اور وفا کیش بھی ہم جیسے تھے آپ اپنی مثال

مطلعِ حسن، ابھرتا ہوا سورج ہے اگر
ہے دل آویز شفق ڈوبتے سورج کا جمال

○

گل و بلبل و سمن و چمن، یہ جہاں جہاں جو امنگ ہے
ترے حسن کی ہے یہ چاندنی کہ بہارِ نکہت و رنگ ہے

مجھے اس کا پینا حرام ہے جو تری نظر سے نہیں ملے
لبِ لالہ سے جو چھلک گئی عجب اس نشے کی ترنگ ہے

میں ترے بغیر نہ جی سکا تو ہے اس میں میرا قصور کیا
مری زندگی تری آرزو، تری جستجو مرے سنگ ہے

انھیں ناز اپنی جفاؤں پہ، مجھے کام اپنی وفاؤں سے
ہے یہی تو شیوۂ دلبراں، یہ مرے جینے کا بھی ڈھنگ ہے

یہ جو اہرمن ہے یہاں وہاں، مری رزم گاہِ حیات میں
اسی اہرمن سے ہوں نبرد زن، مری اس کے ساتھ ہی جنگ ہے

جو سرورِ چشمِ شفق میں ہے وہ نہاں ابھی رگِ تاک میں
جو جھلک رہا ہے افق افق یہ اسی خمار کا رنگ ہے

کرامت بخاری

○

اک غمِ معتبر کا سناٹا
بن گیا عمر بھر کا سناٹا

اک تو منزل کا کچھ سراغ نہیں
اس پہ یہ رہگزر کا سناٹا

چیخ بھی بے صدا نکلتی ہے
اُف یہ کربِ ہنر کا سناٹا

مجھ سے مانوس ہو گیا بے حد
میرے دیوار و در کا سناٹا

مُسکراہٹ میں اس کی سو نغمے
اور اِدھر چشمِ تر کا سناٹا

میری ہم عمر میری تنہائی
میرا ہم سن سفر کا سناٹا

اب تو اشعار بن کے غزلوں میں
گونج اُٹھتا ہے سر کا سناٹا

○

ڈھونڈ کر لایا ہوں اک موسم نیا
میں نیا ہوں اور میرا غم نیا

مشتعل ہے انتہا میں آدمی
ہو رہا ہے شہر میں ماتم نیا

موت کا ماحول ہے چاروں طرف
زندگی پیدا کرے دم خم نیا

اپنی اقلیمِ محبت کے لیے
ہم بنائیں گے کوئی پرچم نیا

کرتا رہتا ہوں سوادِ فکر سے
ہر پرانی بات کو پیہم نیا

آسماں والے کوئی تخلیق کر
اس زمیں کے واسطے آدم نیا

ڈھونڈنا ہوگا مسیحا کو مرے
زخمِ دل کے واسطے مرہم نیا

سلیم زاہد صدیقی

O

لطف ہجر و وصال کچھ بھی نہیں
شب گزاری محال کچھ بھی نہیں

میں نے تسخیر کر لیا اس کو
اس میں میرا کمال کچھ بھی نہیں

کس نے پایا ہے ان بتوں سے فیض
آذری کا مآل کچھ بھی نہیں

کیسے رکھتا مجھے قبیلے میں
میرا ماضی و حال کچھ بھی نہیں

تھے نگاہوں میں سو سوال اس کے
لب تھے ساکت، سوال کچھ بھی نہیں

لٹ رہی ہے حروف کی حرمت
اور کسی کو ملال کچھ بھی نہیں

حمیرا راحت

O

قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے رات
یہ دیا ہے کہ جل رہی ہے رات

تیری مٹھی میں بند ہے سورج
میرے ہمراہ چل رہی ہے رات

دن کے اک بیکراں سمندر میں
گرتے گرتے سنبھل رہی ہے رات

کھو دیا کیا کسی کو اس نے بھی
آج کیوں ہاتھ مل رہی رات

ہے بظاہر یہ میری دوست مگر
چال دشمن سی چل رہی ہے رات

نام لیتے ہی تیرا ایسا لگا
سرخ پھولوں میں ڈھل رہی رات

پروفیسر محمد اویس جعفری (سیاٹل۔امریکہ)

شاعر

دیکھ کر دوشیزۂ فطرت کو شرما جائے ہے
اور کبھی آنچل کو اس کے پیار سے سرکائے ہے

چاک کرتا ہے قبائے گردش دوراں کبھی
اور کبھی بار نفس سے اس کا دم گھٹ جائے ہے

ڈال دیتا ہے کمندیں رفعت تخییل پر
اور کبھی افکار کے ساحل پہ ڈوبا جائے ہے

عظمت لوح و قلم پر سر گرانی ہے کبھی
حرف کی چوکھٹ پہ لیکن سر کبھی جھک جائے ہے

ہے کبھی ہنگامۂ جلوت میں خود سے ہمکلام
اور کبھی خلوت میں اپنی ذات سے گھبرائے ہے

صوت کی خنکی سے کاٹے سنگِ خارا کا جگر
اور ذرا سی بات پر دل کا لہو ہو جائے ہے

توڑ دیتا ہے سبو کو چشم ساقی دیکھ کر
اس کو ٹھکرا کر کبھی دشت جنوں کو جائے ہے

عشق کا پی لے سمندر اور پھر تشنہ رہے
حسن کی اونیٰ ادا پر قتل ہو ہو جائے ہے

لرزہ بر اندام، آنسو اس مژہ پر دیکھ کر
اور کبھی سینہ سپر طوفاں سے ٹکرا جائے ہے

وہ کہ زخموں سے جہاں پر پیار کا مرہم رکھے
اک ذرا سا درد اس کو رات بھر تڑپائے ہے

رحمتِ یزداں پہ تکیہ، اہرمن سے ساز باز
ایسا وہ طرفہ تماشہ بھی کبھی دکھلائے ہے

یاد پھر آیا مجھے غالب کا یہ مصرع اویس
"آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے"

عبدالستار نعیم

ناگفتنی

بدلی سی نظر آتی ہے کچھ صورتِ حالات
بے ربط کئی روز سے ہے موجِ خیالات

ہر شخص سرافگندہ ہے آج اپنے وطن میں
جاری ہے مرے دیس میں اک درد کی برسات

کیا کیا ہیں تقاضائے عدو ہم سے مسلسل
ہم چپ ہیں مگر مثلِ نباتات و جمادات

وہ کرب کا عالم ہے کہ جی خون ہوا ہے
اندوہ کا ہے آن پڑا کوہ ارارات

کچھ ایسے سراسیمہ ہیں اربابِ حکومت
دُبکے ہوئے، سہمے ہوئے، زندانیِ حالات

خاموش ہیں گویا کہ زباں منہ میں نہیں ہے
چہروں پہ ندامت نہ خجالت کی علامات

چھپنے کو کوئی گوشہ میسر نہیں ان کو
اندر بھی خرابات ہے، باہر بھی خرابات

اک طوقِ غلامی ہے جو گردن کی ہے زینت
خوش ہیں کہ ہیں پابستۂ زنجیرِ مفادات

نسلوں سے انہیں شوق ہے دریوزہ گری کا
مرغوب بہت ان کو ہے افرنگ کی خیرات

یہ اب بھی ستم گر کی محبت کے امیں ہیں
فردوسِ سماعت ہے انہیں درسِ خرافات

گھر کے ہیں نہ یہ گھاٹ کے پیسے کی ہوس میں
سرمایہ پرستی کی ہیں یہ تازہ عنایات

کب جائے گا آسیب مرے گھر سے خدایا
کب ٹوٹے گا یہ سلسلۂ جہل و خرافات

مجھ کو تو ضرورت نہیں ان چار ٹکوں کی
اور مجھ کو گوارا نہیں دشنام مراعات

مجھ کو تو وہی شام و سحر پھر سے ملیں کاش
مجھ کو تو ملیں پھر سے وہی ارض و سماوات

اے کاش کہ پھر میرا وطن، میرا چمن ہو
اے کاش کہ لوٹ آئیں وہ دیرینہ روایات

شفیق ہاشمی

انقلاب کی راہ

(مشرقِ اوسط میں بیدار روحِ انقلاب کی نذر)

اٹھے عوام کہ موجِ سبک خرام اٹھی ... سروں کی فصل اُگی، تیغ بے نیام اٹھی
بدل رہا ہے اِدھر ظلم و جور کا بھی مزاج ... لہو شہید کا قاتل سے مانگتا ہے خراج
ہوا نے پرچمِ ہمت کو سربلند کیا ... فضا نے سرو چمن کو بھی ارجمند کیا
زمیں نے بڑھ کے قدم چومے خاک زادوں کے ... جوان حوصلے دیکھو وہ خوش نہادوں کے
فلک سے رحمتِ رب کا نزول ہوتا ہے ... لبوں پہ حرفِ دعا ہو قبول ہوتا ہے
سوادِ شب میں بھی ظالم کو کب ملی ہے پناہ ... لعین ڈھونڈتا پھرتا ہے اب فرار کی راہ
اُسے یہ ڈر کہ نمودِ سحر قریب نہ ہو ... اُسے یہ ڈر کہ سرافراز کم نصیب نہ ہو
جو موجِ طوق و سلاسل ہے پھر بچے گا کون ... نہ قہرِ ہیبتِ فرعون و لشکرِ فرعون
ابھی تو نیل کی موجوں نے سر ابھارا ہے ... ابھی تو ضربِ کلیمی کا اک اشارہ ہے
دیارِ عقبہ[1] ہو، یا قلعۂ[2] صلاح الدین ... جہادِ راہِ وفا کا نصیب فتحِ مبین

ہو جتنا جور و ستم حوصلے جواں رکھنا
یہ قافلہ سوئے منزل رواں دواں رکھنا

---

[1] عقبہ بن نافع کی سرزمین تیونس

[2] مصر کی عظمتِ رفتہ کا مینار قلعہ صلاح الدین

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

نغمۂ سحر

یہ کارواں جو سرِ منزلِ نگاہ رُکا — شکستہ پا ہے سحر بھی کہیں قریب نہیں
یہ انتظار میں ٹھہرا کہ معجزہ ہو جائے — سفر کا اور بھی ہموار راستہ ہو جائے
فضا میں اڑتے ہوئے طائروں کی آوازیں — کہ جس طرف سے وہ آئے ہیں چہچہاتے ہوئے
اُدھر بھی جھیل کا منظر یہ دے رہا ہے خبر — کہ زندگی سے ہے بھرپور یہ سہانا سفر
کھلے ہیں پھول کہ جیسے حسین چہروں پہ — کسی نے رنگ بکھیرے ہوں سرخوشی میں کہ اب
اسی زمین سے رشتہ بنا ہے مستقبل — مگر یہ خواہشِ بے نام بھی نہ کام آئی
طلوعِ صبحِ بہاراں سے پہلے شام آئی — بنی ہے شامِ غریباں کہ اپنے لوگوں نے
بنامِ امن اسی کارواں کو آگھیرا — یقیں کی راہ نگاہوں سے ہو گئی اوجھل
زمیں کا بوجھ بنا کارواں کا رختِ سفر — ہر ایک شخص کا سرمایہ صرف دیدۂ تر
کوئی تو مشعلِ ذوقِ نظر جلائے یہاں — کسی کے دل میں تو اک حشر سا بپا ہو جائے
کوئی تو ابھرے قیادت یہاں سحر آثار — یہاں نہ اپنوں پہ شب خون کوئی اب مارے
کسی میں جرأتِ تردیدِ مدعا نہ رہے — کوئی نہ راستہ روکے نہ قافلہ ٹھہرے
شبِ سیاہ کے لشکر سمندروں میں گریں — اندھیرے کاٹ کے نکلے شعاعِ عزمِ سفر
شفق بھی صورتِ گل رنگ یوں بکھر جائے — افق سے تابہ افق نغمۂ سحر جائے

یہ کارواں بھی کہیں اب نہ لمحہ بھر ٹھہرے
دعا ہے منزلِ جاناں بھی ہمسفر ٹھہرے

صابر عظیم آبادی

رباعیات

تصویر پرانی مری واپس کر دے
وہ چڑھتی جوانی مری واپس کر دے
گر یہ بھی کسی طور نہیں ممکن تو
اے دوست نشانی مری واپس کر دے

☆☆☆

اخلاق کا جو بیج ہے بویا جائے
نفرت کے بچھونے پہ نہ سویا جائے
دل کھول کے ہنسنے کا زمانہ آیا
رونے کا نہیں وقت کہ رویا جائے

☆☆☆

رعنائی تنویر سے روشن ہے بدن
نرگس ہے تری آنکھ تو سوسن ہے بدن
آتا ہے نظر جلوۂ صد رنگ مجھے
یہ تیرا سراپا ہے کہ درپن ہے بدن

☆☆☆

کاندھے پہ مرے بارِ گراں ہوتا ہے
جو چاہتا ہوں میں وہ کہاں ہوتا ہے
اے خالق کونین مری طاقت کیا
سب کچھ تری مرضی سے یہاں ہوتا ہے

☆☆☆

آئے ہو تو چھب اپنی دکھاتے جاؤ
مسکان کے کچھ پھول کھلاتے جاؤ
جانا ہے ضروری تو چلے جانا مگر
پہچان کی خوشبو تو بساتے جاؤ

☆☆☆

مانا کہ مصیبت نہیں دیکھی جاتی
آنکھوں سے یہ غربت نہیں دیکھی جاتی
محنت سے کرو اپنے گھروں کو روشن
ہر بات میں قسمت نہیں دیکھی جاتی

☆☆☆

حالات کو ابتر نہیں ہونے دیتا
غائب کوئی منظر نہیں ہونے دیتا
رکھتا ہے وہ قابو میں ہمیشہ مجھ کو
اوقات سے باہر نہیں ہونے دیتا

☆☆☆

دے ساغر سے ہاتھ بڑھا کر ساقی
میخواروں کو دیوانہ بنا کر ساقی
تقسیم مگر کرنے سے پہلے صہبا
تہذیب کے کتبے کو پڑھا کر ساقی

☆☆☆

مضطر اکبر آبادی

قطعات

نظر اٹھے جو کسی صاحب نظر کی تو پھر
تسلسل سحر و شام ٹوٹ جاتا ہے
ہیں ایسے لوگ بھی دنیا میں جن سے ٹکرا کر
غرور گردشِ ایام ٹوٹ جاتا ہے

اپنی جھوٹی انا کی مے پی کر
رقص کرتا ہوں جھومتا ہوں میں
مجھ سا نافہم بھی تو ہوگا کوئی
اردگرد اپنے گھومتا ہوں میں

جدائی سے تو سُنی تھی شکستگی دل کی
مگر یہاں تو یہ رشتہ ملن سے ٹوٹ گیا
تھا ایسا نازک و حساس آئینہ دل کا
نظر نظر سے ملی تھی کہ چھن سے ٹوٹ گیا

جان کر خود کو ناتوان و نحیف
رشتہ خود سے بھی میں نے توڑ لیا
ہے جو سب قوتوں کا سرچشمہ
رابطہ صرف اُسی سے جوڑ لیا

تجھ سے ملنے کی سعادت جو مجھے مل جاتی
دولتِ کون و مکاں کو بھی میں ٹھکرا دیتا
گزرا ہوتا جو ترے قرب میں اک لمحہ بھی
طول دے کر اُسے صدیوں پہ میں پھیلا دیتا

دودھیا دودھیا سا ہے ماحول
اور پہاڑوں پہ ہے جمی ہوئی برف
باہمی ربط ضبط کا فی الوقت
فیصلہ ہے درست حرف بہ حرف

آ ہی گئی زباں پہ اچانک مری وہ بات
جو تھی تو مختصر سی مگر بڑھ گئی بہت
ثابت ہوئے کچھ اس قدر کم ظرف بعض لوگ
تھوڑی سی پی ہوئی بھی انہیں چڑھ گئی بہت

جب اترتی ہے رات دنیا پر
بھوکا پیاسا فقیر جاگتا ہے
سوئے رہتے ہیں بے ضمیر مگر
ایک روشن ضمیر جاگتا ہے

نقد و نظر

کتاب : بیسویں صدی کی اردو شاعری

مصنف : ڈاکٹر انور سدید

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : مقبول اکیڈمی چوک اردو بازار سرکلر روڈ۔ لاہور

قیمت : ۲۵۰ روپے

"ڈاکٹر انور سدید پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے پڑھا زیادہ ہے یا لکھا؟ شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اُن کی نظر سے نہ گزری ہو اور شاید ہی کوئی موضوع ہو جسے ان کے اشہبِ جہندہ قلم نے پامال نہ کیا ہو۔"

عین ممکن تھا کہ میں ڈاکٹر انور سدید کے متعلق مرحوم مشفق خواجہ کی درج بالا رائے کو مبالغہ پر محمول کرتا لیکن حسنِ اتفاق کہ مجھے ہر دو شخصیات سے شرفِ تعارف و نیاز مندی حاصل ہے۔ خواجہ صاحب کی اصابت رائے اور محتاط و ذمہ دارانہ نقد و نظر کے رویوں کا میں ہمیشہ معترف رہا ہوں محترم انور سدید سے قبل از تعارف کا عہد بھی ان کے علم و فن سے کچھ ایسی عدم شناسی کا دور نہ تھا کہ وہ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے اقلیم ادب کے مشاہیر میں ایک نمایاں شخصیت ہوں اور میں اُنھیں نہ جانتا ہوں لیکن ان سے ذاتی تعلق و ارادت کے بعد سے ان کے فکر و فن کی ہمہ جہتی بالخصوص ان کی انتقادی بصیرت کا میں دل سے معترف ہوں۔ زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ نے مزید ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ انور سدید، ایک عہد بسیط مکمل آگہی کی علامت اور اس کی بوقلمونی کے چشم دید گواہ ہی نہیں بلکہ ایک معتبر شناخت بھی بن چکے ہیں۔ فاضل مصنف نے ۲۸۰ صفحات پر مشتمل کتاب میں اپنے مطبوعہ مضامین و مقالات کے ذریعہ شعر و ادب سے متعلق معروف و کم

معروف اور بعض غیر معروف شخصیات کا انتخاب کر کے کم وبیش ایک صدی پر مشتمل معاصر رجحانات کی ترجمان شاعری اور نمائندہ ادب وصحافت کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ مثلاً حکیم آزاد انصاری (۱۹۴۱-۱۸۷۰ء) جن کا بقول مصنف اردو ادب کی تاریخوں میں تذکرہ کم کم ملتا ہے ان کی زندگی کے معلوم و نامعلوم گوشوں کو ذمہ دارانہ تحقیق کے بعد نہایت خوبصورتی سے متعارف کرایا ہے۔ مجھے خود یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ حکیم آزاد انصاری نے مالیر کوٹلہ اور تھانہ بھون کے علاوہ میرے وطن مالوف گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) کے عربی مدرسے "منبع العلوم" میں بھی تعلیم حاصل کی جس کی بنیاد حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ (۱۸۸۰-۱۸۳۲ء) نے ۱۸۶۷ء میں اپنے دست مبارک سے رکھی اور جسے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی گرانقدر کاوشوں اور عظیم مدبرانہ اور عالمانہ صلاحیتوں کے نتیجہ میں ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ "دارالعلوم" کا مقام و منصب حاصل ہوا۔ اسی طرح ایک معروف شعر:

افسوس بے شمار سخنہائے گفتنی ‏ ‏ ‏ ‏ خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

کے خالق کا نام تحقیق طلب تھا اس کی نشاں دہی فاضل مصنف نے حکیم آزاد انصاری کی نسبت کردی جو ایک زمانے میں عطار دتخلص کرتے تھے:

عطارد کوشش کسب ہنر سے فائدہ کیا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ہنرمندوں سے بہتر آجکل ہیں بے ہنر دیکھو

انصاری صاحب کے تلامذہ میں منجملہ دیگر صفیہ شمیم ملیح آبادی، محمود علی خاں ماہر دہلوی اور وقار انبالوی شامل تھے جن میں سے مجھے اپنے بچپن میں دہلی کے دو ایک مشاعروں میں جناب ماہر کو سننے کا موقع ملا جن کا یہ شعر میری لوح حافظہ پر آج تک نقش ہے۔

جھونکے حوادثات کے کام اپنا کر گئے ‏ ‏ ‏ ‏ ماہر چراغ زیست کی لو تھرتھرا گئی

محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی کو جو خانوادۂ جوش سے تعلق رکھتی تھیں متعدد بار پاکستان کے مشاعروں میں ترنم ریز دیکھا بھی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ البتہ وقار انبالوی مرحوم سے اپنی انفارمیشن سروس کے دوران (۱۹۵۹-۶۰ء) لاہور میں خاصا ربط وضبط رہا۔ مرحوم بڑے باغ و

بہار، ورزیرک وصباح انسان تھے انور سدید صاحب نے آزاد انصاری کی شاعری کے مدوجزر جو پیش رو اساتذۂ شعر کے اسالیب کے مرہون منت تھے بڑی خوبصورتی سے واضح فرمائے ہیں اور انھیں بنیادی طور پر غزل کا شاعر قرار دیتے ہوئے اشعار کے حوالے دیے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

انسان کی بدبختی اندازے سے باہر ہے ۔۔۔ کم بخت خدا ہو کر بندہ نظر آتا ہے

مجھے آزاد اگر کوئی کسی قابل سمجھتا ہے ۔۔۔ تو اس کا حسن ظن ہے ورنہ من آنم کہ من دانم

''فیض کی غزل میں نعت کا عنصر'' کے زیر عنوان صاحب تصنیف نے نہایت بلیغ انداز میں فیض مرحوم سے متعلق مذہب سے بیگانگی کا تسلسل سے جو ایک تاثر پایا جا تا رہا ہے اس کا معتبر حوالے سے ازالہ کیا ہے اور ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کی گرانقدر تالیف ''نعت اور تنقید نعت'' کو بنیاد بنا کر ایسے شعر پیش کیے ہیں جن میں نعتیہ شاعری کے نقوش نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

شمع نظر خیال کے انجم، جگر کے داغ ۔۔۔ جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اور پھر کشفی صاحب کا درج ذیل تجزیہ پیش کر کے بات کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا۔

''فیض صاحب کی زندگی اور ان کی شاعرانہ حیثیت میں مذہب کے گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے جیل کے ساتھیوں کی شہادت موجود ہے کہ وہ ایام اسیری میں درس قرآن حکیم دیتے تھے۔ پھر یہ روایت کہ وہ اپنی وفات سے پہلے اپنے آبائی وطن گئے اور وہاں نماز کی امامت کی''

مجھے یہ دیکھ کر بھی خوشگوار حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر انور سدید نے ایک ایسے شاعر کو بھی اپنے ایک مقالہ کا موضوع بنایا ہے جو درویش منش۔ عزلت نہاد۔ منکسر مزاج ۔ مرنجاں مرنج اور مستغنی الفطرت تھا۔ بے نیازی کا یہ عالم کہ اپنے کمالات شاعری کو متعارف کرانے یا ذرائع ابلاغ تک رسائی کا خیال تک بھی کبھی ذہن میں نہ آیا اور ہمیشہ خود کو منتخب احباب تک محدود رکھا۔۔ عمر فیضی کی رباعی' کے زیر عنوان اپنے مقالہ میں ڈاکٹر انور سدید نے یہ کہہ کر کہ ''رباعی کے لیے بحر ہزج

کے جو چوبیس اوزان مقرر ہونے کے باوجود ہر سخن گو رباعی کہنے پر قادر نہیں"۔ عمر فیضی کی رباعیات کے مجموعے "دشت جنوں" پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مرقومہ "پیش لفظ" سے یہ اقتباس بھی پیش کیا ہے کہ "اردو شاعری میں کوئی ابوسعید ابوالخیر کوئی سرمد شہید اور کوئی عمر خیام نظر نہیں آتا" لیکن مجھے جو محمد عمر خاں فیضی سابق متوطن قصبہ اورنگ آباد ضلع بلند شہر (یو۔پی) اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فیضان تعلیم و تربیت سے آراستہ ایک دلپذیر و شائستہ شخصیت سے پہلی بار ۱۹۵۶ء میں گورنمنٹ کالج میانوالی میں متعارف ہونے کا موقع ملا جو بعد میں برسوں کی رفاقت و محبت میں تبدیل ہو گیا اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ فیضی صرف غزل و رباعی ہی کا نہیں بلکہ ایک کثیر الاصناف شاعر تھا جس نے بالخصوص غزل اور دوہا نگاری میں اُس صلاحیت کا مظاہرہ کیا جو بالعموم نظروں سے اوجھل رہا۔ عمر فیضی کی شخصیت اور شاعری کا نوٹس لینے پر جناب انور سدید کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فیضی کے صرف تین اصناف شعری سے درج ذیل حوالے دینا چاہوں گا جس کے بعد صاحبان ذوق اور اہل نظر فیضی کے شعری گداز کی کیف پرور لطافت محسوس کر سکیں گے۔:

قطعہ

دل خوں گشتہ سدا صبر کی خاطر تر ہے — اشک آنکھوں میں جو بھر آئیں تو پی بھی نہ سکوں
مجھ سیہ بخت پہ اس درجہ عنایات نہ کر — کہ کبھی تجھ سے بچھڑ جاؤں تو جی بھی نہ سکوں

غزل:

گردن میں تیرے ڈال کے بانہیں خیال کی — ہم نے لیا فراق کی راتوں سے انتقام

دوہا:

ہونٹ سلے پر من کی چتا پھیلی جیسے بن کی آگ
تانت نہ باجی پھر بھی فیضی بوجھ لیا محفل نے راگ

جان سے پیارے تھے جو ارماں اب وہی جی کے لاگو ہیں
فیضی صاحب آپ نے خود ہی دودھ پلا کر پالے ناگ

"بیسویں صدی کی اردو شاعری" کے فاضل مصنف نے جن نابغہ شخصیات کی نعت گوئی پر اظہار خیال کیا ہے ان میں مرحومین عاصی کرنالی، یزدانی جالندھری اور حفیظ تائب جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ مجھے عاصی مرحوم سے بالخصوص ملتان کے دوران قیام اور بعد میں بالعموم جو قربت و محبت کا شرف حاصل رہا اس کے پیش نظر مجھے فاضل مصنف کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے۔

"میں عاصی کرنالی کو ایسے شعراء میں شمار کرتا ہوں جنھوں نے مدحت نگاری کو اپنے فن کی ایک روشن کرن قرار نہیں دیا بلکہ اُسے زادِ آخرت کے طور پر قبول کیا اور جب نعت کی وجدانی سرمستی سے گزرے تو اس نہایت کو بھی پالیا جو صرف سوز دروں سے حاصل ہوتی ہے۔"

ثبوت کے طور پر صرف دو شعر ایک مدحت اور دوسرا نعت سے

ہاتھ کس کا شب کی زلفوں میں پروتا ہے نجوم ۔۔۔ صبح کے رخسار پر سورج سجا دیتا ہے کون

خورشید جس کے نور کا اک اقتباس ہے ۔۔۔ اس کا جمال میری نظر کا لباس ہے

یزدانی جالندھری کے بارے میں انور سدید کہتے ہیں کہ "غزل کی طرف ان کی رغبت ان کی شاعری کی ضرورت تھی لیکن نعت کی طرف پیش قلمی ☆ ان کی روح کی آواز ہے"

برسا ہے ابر رحمتِ باری تمام رات ۔۔۔ دامن گُشا رہا ہے بھکاری تمام رات
یزدانی رات نعتِ نبیؐ میں بسر ہوئی ۔۔۔ عالم سُرور کا رہا طاری تمام رات

فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے حفیظ تائب کی والہانہ عقیدت اور محبت کا اعتراف کیا اور فرمایا کہ "انھوں نے اپنے اکثر مضامین قرآن پاک سے لیے ہیں اور یہ ایسی سعادت ہے جو بہت سے نعت نگاروں کو نصیب نہیں ہوئی۔"

☆ پیش قلمی کی ترکیب وضع کرنا نعت کے احترام کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے ورنہ ذہن پیش قدمی کی طرف جاتا ہے۔ (ادارہ)

مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ جناب حفیظ تائب حافظ لدھیانوی مرحوم کے ہمراہ جو میرے مخلص رفیق تھے اسلام آباد میں میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور اپنی نعت گوئی سے کیف سرمدی عطا فرما گئے:

انداز پذیرائی سے ہوا رنگ ان کی محبت کا گہرا — رحمت کے دریچے اور کھلے رحمت کا تقاضا اور ہوا

زیر تبصرہ کتاب جس کا عنوان ڈاکٹر انور سدید کے اپنے ہی ایک مضمون سے ماخوذ و مستعار ہے دو درجن ابواب پر مشتمل ہے جن میں مولوی عبدالحق اور مولانا صلاح الدین احمد کی ادبی صحافت پر نادر و یادگار مقالات شامل ہیں جی چاہتا ہے کہ ایک ایک سطر کا جو مطالعہ کی ہے اپنے اس جائزے میں احاطہ کروں لیکن ایسا ممکن نہیں تاہم میں اسے اپنی خوش بختی تصور کرتا ہوں کہ مجھے ۱۹۵۳ء میں بہاولپور میں کل پاکستان اردو کانفرنس کے موقع پر بابائے اردو کا دیدار نصیب ہوا اور اُس افتتاحی اجلاس کا جس کی صدارت مولوی صاحب نے فرمائی ناظم مجلس ہونے کا اعزاز بھی میرے حصے میں آیا۔ یہ افتخار بھی میرے لیے کم نہیں کہ پچاس ہی کی اوّل نصف دہائی میں مجھے مولانا صلاح احمد مرحوم کو حلقۂ ارباب ذوق کی ہفتہ وار نشستوں میں دیکھنے۔ سننے اور اُن اوصاف حمیدہ سے استفادہ کرنے کے مواقع میسر آئے جن کا ذکر فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

کتاب	:	ذرا بارش کو تھمنے دو (نظموں کا مجموعہ)
مصنف	:	امین راحت چغتائی
مبصر	:	سید منصور عاقل
ناشر	:	گگریز پبلی کیشنز۔ راولپنڈی
قیمت	:	تین سو روپے

چغتائی صاحب سے تعارف و تعلق کو اب کئی دہائیاں بیت چکیں لیکن ان کی ثقہ و شائستہ

شخصیت کا پاکیزہ و لطیف تاثر آج بھی اُسی طرح تر و تازہ ہے جیسا کہ پہلے دن تھا۔ وہ ایک ذمہ دار صحافی۔ صاحب بصیرت ادیب۔ حساس شاعر۔ معروضیت نواز ناقد۔ محبِ وطن دانشور۔ دقیقہ شناس محقق۔ کثیر المطالعہ تاریخ داں، وسیع النظر مذہبی سکالر ہیں۔ ان تمام اوصاف کی یکجائیت نے جو انھیں ایک وصف خاص عطا کیا ہے وہ ہے اُن کی ضرب المثل منکسر مزاجی۔ بقول صائب

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال ۔۔۔ کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

موصوف کی عمر عزیز کے ماہ و سال تحصیل علم، ترسیل علم اور تبلیغ دین میں بسر ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کو اگر احاطہ کیا جائے تو محدود تعداد کے باوجود گرانقدر کہی جا سکتی ہیں۔ اور ان کی شخصیت کی جامعیت اُن کی ہر تحریر میں دیکھی جا سکتی ہے ''قرآن اور نظام کائنات'' کے زیر عنوان اُن کی ایمان افروز کتاب اور نعتیہ مجموعہ ''محراب توحید'' ان کے شعور و وجدان کے دو نادر شاہکار ہیں ''مغل کتب مصوری سولھویں صدی عیسوی میں'' ان کا ایسا مطبوعہ تحقیقی مقالہ ہے جسے کوئی بھی جامعہ اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات میں شامل کرنے کا اعزاز حاصل کر سکتی ہے لیکن صاحب مقالہ کی قناعت پسندی کہ ''ہر چہ گیرید مختصر گیرید''

''دلائل'' اور ''ردِ عمل'' کے زیر عنوان تنقیدی و تحقیقی مضامین پر مشتمل دو مزید مطبوعات فاضل مصنف کی علمی ژرف نگاہی کے معتبر شواہد ہیں۔ حمد و نعت اور نظم و غزل کی اصناف شعر پر اُن کی دسترس کے اہل علم معترف ہیں چنانچہ ان کے دو شعری مجموعوں ''بعید بھنور (۱۹۸۶ء) اور ''بام اندیشہ'' (۲۰۰۸) کے بعد نظموں پر مشتمل تازہ ترین تصنیف (۲۰۱۱) ''ذرا بارش کو تھمنے دو'' کے بارے میں طلیب نگار ڈاکٹر ناصر عباس نیر کیا فرماتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''عصری نظم نگاروں میں امین راحت چغتائی کا اپنا ایک مقام ہے وہ حسیاتی، نفسیاتی، عمرانی و تاریخی موضوعات سے اپنی نظم کے تار و پود بنتے ہیں اور غزل سے زیادہ نظم کو ''بت ہزار شیوہ'' سمجھتے ہیں لہٰذا اگر ان کی نظم کو اسی تناظر میں دیکھا جائے تو ابلاغ کے مرحلے آسان ہو جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی اپنے "پیش لفظ" میں شاعر کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے فرماتے ہیں:

"چغتائی صاحب نے بحیثیت مجموعی شاعری کے رموز کی اور ایمائی پیرایوں کی خوبی سے پیروی کی ہے۔۔۔ انھیں آتشدان سے چراغ کی آخری لو کو ربطِ خفی دینے کا ہنر آتا ہے"

مذکورہ بالا آراء سے قطع نظر بھی میں نے چغتائی صاحب کے زیرِ تبصرہ مجموعے میں مزید گوشے تلاش کرنے کی کوشش ہے، ور دیکھا ہے کہ ان کا موثر ترین ہنر حُسنِ اُسلوب (Beauty of Diction) ہے جس کو انھوں نے اپنے ذخیرۂ معارف سے پُرشکوہ بھی بنا دیا ہے چنانچہ لفظ و معنی میں ربط و توازن کی کیفیت قاری کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ شاعر نے بعنوان "حباب" جس میں حمد باری تعالیٰ سے حسبِ معمول آغاز کلام کیا ہے وہ حسنِ اسلوب کا ایک نادر مرقع ہے۔ چند سطور ملاحظہ ہوں

یہ آرزوئے نمود تیری شفق کے رنگوں میں ڈھل گئی ہے
کہیں طلوعِ سحر کا منظر دکھا رہی ہے کہیں بہاروں کے پیرہن کی مہک میں تحلیل ہو گئی ہے
کہیں گلابوں کا رنگ بن کر کہیں گھروندوں میں روشنی کی رمق سے تعبیر ہو رہی ہے
حیائے عارض میں رچ گئی ہے کہیں محبت کی وادیوں میں
کہیں افق پر دلوں کے غنچے کھلا رہی ہے

حمد کے فوراً بعد ایک دعائیہ نظم (جب صبح کے آنگن میں) ہے جس میں اُسلوب کا حسن اور بھی نکھرا نکھرا نظر آتا ہے شاعر نے اس حسن کو خوبصورت لفظیات کا زیور پہنا کر اور بھی جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ چند سطور:

جب صبح کے آنگن میں چلبل پرندوں کی توفیق اطاعت سے ضو ریز بناتی ہے
تہذیب سماعت سے دھن میں اترتی ہے کرتی ہے گلی کوچے معمور درودوں سے
تکبیر اذاں بن کر کتنی ہی جبینوں کو محسوس یہ ہوتا ہے پھر کوئی دعا پہنچی

دوسری اہم بات جو کسی بھی محویت سرشت قاری کو متوجہ کرتی ہے وہ الفاظ کے پس منظر میں شاعر کا وسیع مطالعہ، مشاہدہ اور متنوع لسانی گرفت ہے جسے اردو کے علاوہ عربی و فارسی الفاظ نے جمالیات کا مرقع بنا دیا ہے۔ امین راحت کے فکروفن کا یہ رنگ و آہنگ آپ کو ان کی تمام شاعری پر جلوہ بار نظر آئے گا۔ ان کا زیر نظر کلام ننانوے (۹۹) نظموں پر محیط ہے لیکن انھوں نے اپنے مجموعے کو جو نام دیا ہے وہ اسی مجموعہ میں شامل ایک نظم کے عنوان (ذرا بارش کو تھمنے دو) سے بوجوہ ماخوذ ہے جس کے لیے قاری کو رمزیت و اشاریت کے مہین پردوں کے دوسری طرف جھانکنا ہوگا۔

ذرا بارش کو تھمنے دو

نئی کلیوں کو کھلنے دو — دعا کو ہاتھ اُٹھاؤ
بہت کچھ دیکھنے سننے کو مل جائیگا باغوں میں — زینتِ گلشن انھیں سے ہے
اگر غنچے چٹکنے کی کہیں مدھم صدا آئے — وگر چہکار چڑیوں کی
اسے بھیگی رتوں کا ایک اسلوبِ بیاں کہہ لو — کہیں کانوں میں رس گھولے
اگر نکھرے ثمر شاخوں پہ جھولا جھولتے دیکھو — اُسے سرشار روحوں کی ثنا سمجھو

چنانچہ امین راحت کا یہی اسلوب ان کی تمام نظموں میں ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' بن کر دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ نظم ''نقشِ ارژنگ'' شاعر کے حُبِّ وطن کا لازوال شاہکار ہے جسے انھوں نے موزوں ترین لفظوں میں میزان کر دکھایا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

سرخیٔ عارضِ گل تیری شفق کی غماز — رنگ انداز تبسم تری صبحِ خنداں
باعثِ راحت و آرامِ جہاں دھوپ تری — چاندنی جلوۂ انوارِ رخِ سیم براں
تیرے ہر کنج میں لہرائے بہارِ تازہ — خاک گلیوں کی تری زہرہ وشوں کا غازہ

حُبِّ وطن کے تقاضے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ شاعر کو جذبہ و احساس کے عجیب تر تنوعات سے دوچار کر دیتے ہیں۔ آیئے نظم ''بے نور وسعتیں'' میں ہم بھی شاعر کے ساتھ ''مرگِ تبسم'' پر آنسو بہائیں اور عصری تلخ حقیقتوں سے اپنے قومی ادراک کو جھنجھوڑیں:

آؤ حدیثِ مرگِ تبسم سنائیں ہم — اک شہرِ ناشناس پہ آنسو بہائیں ہم
اے بزمِ میکدہ کے رفیقو! کسی کو ہم — کس کس کو یادِ موسمِ گل میں رلائیں ہم
زخمِ نظر کہ زخمِ جگر، چارہ گر بتا — اک فرصتِ نفس میں تجھے کیا دکھائیں ہم
ہر کُنجِ گلستاں پہ ہے صیاد کی نظر — کس شاخِ گل پہ اپنا نشیمن بنائیں ہم
پھر سوچتے ہیں کوئی تو دستک کرے پتہ سے — گلیوں میں شب کے پچھلے پہر پھیل جائیں ہم

امین راحت کے ہاں قنوطیت حادثوں کے فوری ردِ عمل کے طور پر تو ایک فطری اظہار کا روپ دھار لیتی ہے لیکن اُنھیں سرنگوں نہیں ہونے دیتی۔ رجائیت ان کی شخصیت کا توانا تر پہلو ہے جس کی جھلک آپ ان کی نظم "ردِ عمل" میں دیکھ سکتے ہیں جس کا آخری بند یہ ہے:

اوڑھ لو موت کا بے رنگ کفن چارہ گرو — زندگی اُٹھی ہے خود دردکا درماں لے کر
لب ندہ صیلہ سے جاں سے کبھی بجھیں گے — صبح تو آئے گی پیغامِ بہاراں لے کر

اگر طوالت مانع نہ ہوتی تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس مجموعہ میں شامل اور کئی نظموں سے حوالے دیتا کہ قدرت نے شاعر کو کس قدر فکر و نظر کی وسعت اور عروسِ سخن کی مشاطگی کا سلیقہ عطا کیا ہے۔ ان نظموں میں خاص طور پر "خامشی آبرو ہے حرمت کی"، "ابدی شعلے" "مارٹیٹ بلڈ زنیٹ" (۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں پنٹاگون پر طیاروں کے حملے سے متاثر ہو کر کہی گئی نظم)، "وجدان" (گوانتانا موجزیرے کے اسیروں کی نذر)، "آتشِ نمرود" اور "شہر آشوب" نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا جن میں جذبہ احساس کی شدتوں کو امین راحت چغتائی نے مکمل بلاغتِ فن کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کتاب میں ایک نظم "نذرِ فیض" بھی شامل ہے جو جناب فیض احمد فیض پر کہی گئی اور ۱۶ فروری ۱۹۵۲ء کو روزنامہ 'امروز' لاہور میں شائع ہوئی۔ لگتا ہے کہ اردو و فارسی کے جن اساتذۂ شعر نے جناب امین راحت کو اپنا گرویدہ بنالیا ان میں حافظ و بیدل اور غالب و اقبال کے بعد فیض ہیں جن کی نذر کی جانے والی نظم کے آخری بند میں جو عہد جناب چغتائی نے کیا ہے وہی ان کی حیاتِ ادبی کا نصب العین

بن گیا ہے:

ہم آج پھر سے تری رہبری کی کھائے قسم ۔۔۔ نگارِ فن کو سنواریں گے عہد کرتے ہیں
حیاتِ نو کو رچائیں گے شعر و نغمہ میں ۔۔۔ شعور و ہنر نکھاریں گے عہد کرتے ہیں

کتاب : سخن اس کے ستارے ہیں (شعری مجموعہ)

شاعرہ : عائشہ مسعود ملک

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز۔ راولپنڈی

عائشہ مسعود ملک کی نگارشاتِ نظم و نثر سے میرا تعارف بالکل نیا نیا ہے حالانکہ زیرِ نظر تصنیف ان کا چوتھا منظوم کلام ہے اور اگر "حرفِ نگفتہ و سخنِ ناشنیدہ" کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ غالب کے لفظوں میں "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ" بھی کہی جا سکتی ہیں کہ ان کی ایک درجن تصانیف میں تقریباً نصف درجن وہ ہیں کہ جنھیں ابھی معنۂ شہود پر جلوہ گر ہونا باقی ہے۔ مصنفہ ایک معروف کالم نگار بھی ہیں۔ اس لیے صحافی بھی اور افسانہ نگار بھی کہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بعنوان "پالکی" زیورِ طباعت سے مرصع ہونے کے مراحل سے گزر رہا ہے چنانچہ بحیثیت اہلِ قلم ان کے فکر و فن کی کثیرالجہتی پر میں انھیں آفرین ہی کہہ سکتا ہوں۔

"سخن اُس کے ستارے ہیں" عائشہ مسعود کی ایک غزل کے مطلع سے مستعار لیا گیا ایک ایسا حسنِ استعارہ ہے جس نے کتاب کے سرورق کو صوری و معنوی اعتبار سے اور بھی جاذبِ فکر و نظر بنا دیا ہے۔ مطلع یہ ہے:

کبھی دیکھو لبِ خنداں سخن اس کے ستارے ہیں ۔۔۔ کبھی دیکھو شبِ فرقت یہی منظر ہمارے ہیں

چنانچہ میں نے نیک سے ان کی شاعری میں ان کے فکری زاویوں کی تلاش شروع کی۔ البتہ ایک کٹھن مرحلے سے بھی گزرنا پڑا کہ زیرِ نظر شعری مجموعہ میں تقریظ، دیباچہ یا پیش لفظ نام کی کوئی چیز ہاتھ نہ آئی۔ تاہم مصنفہ کا تحریر کردہ ایک سہ ورقی افتتاحیہ بعنوان ''لڑکیاں زندگی سے ملتی ہیں'' نظر سے گزرا جس نے بہت سی گتھیاں سلجھا دیں کہ یہ ایک جگ بیتی ہی نہیں بلکہ آپ بیتی کا بھی مرقع ہے جس کا اختتام ایک ایسے جملے پر ہوتا ہے جو غزل جیسی ایمائیت لیے ہوئے ہے:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں   ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

وہ جملہ یہ ہے ''ہاں اب۔۔۔ ایک لفظ ایسا ہے کہ جسے ابھی گویائی کی خلعت پہنانا ہے اور ایک دن آئے گا کہ میں وہ لفظ ضرور ادا کروں گی۔''

مگر میں نے اس 'لفظِ بے صوت و صدا' کی گونج عائشہ کے پیشِ نظر کلام میں محسوس کی ہے ان کا ارتقا پذیر شعور پختہ تر ہونے کے شواہد مہیا کر رہا ہے۔ مزاحمانہ فکر کے ابلاغ میں اُن کے اسلوب کی جامعیت ان کی ڈھال بن گئی ہے۔ ان کے حسیاتی تلازمات غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہو چکے ہیں۔ قدیم و جدید کا امتزاج ان کا اختصاص بن گیا ہے۔ ان کے تر و تازہ لہجہ میں عصری معنویت کا تاثر عمیق سے عمیق تر ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور وہ صنفِ نازک کے عمرانی تصور کو انقلابی فعالیت سے ہمکنار کرنے کے کوشاں نظر آتی ہیں۔

چشمِ تر سے ہم نے دل کے موسموں کو نم کیا   کس نے ایسا امتزاجِ شعلہ و شبنم کیا
کر دیئے گل کس نے حرف و صوت کے سارے چراغ   کس نے بے آواز میرے شہر کا موسم کیا

میں مانگ لوں گی تراوصل چاندنی سے بھی   دعاؤں کی ہے گھڑی چاند نصف رات میں ہے
بہت سے لوگ یہاں خوش کلام ہیں لیکن   کوئی تو شے ہے کہ اُس دلربا کی بات میں ہے

عائشہ مسعود کا اگر غالب رجحان صنفِ غزل کی طرف ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس پری کے سحرِ سامری سے آج تک کون محفوظ رہ سکا ہے؟ عائشہ کے ہاں مطالعہ کا فیضان نمایاں ہے

لیکن تخلیقی کاوش تقلید کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ انھوں نے نئی اور مشکل ردیفیں وضع کی ہیں۔ ان کی غزل کا درج ذیل شعر یقیناً غالب کی اس غزل کی جانب ذہن کو منتقل کر دیتا ہے جس کے مطلع کا مصرعۂ اول ہے کہ "غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں"

لیکن عائشہ نے اپنی تخلیقی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ ملاحظہ ہو:

خاک بسر ہے زندگی بجھنے لگی ہے روشنی　　میں نے فیک کہا کریں میں نے نہیں کہا کریں

تیز ہوا کے رقص میں بکھرے ہیں رنگ چار سُو　　مثلِ حنا دروں بُروں میں نہیں کہا کہ یوں

مزید دیکھیے

گلاب رنگ ہے اس کا جمال بیش نہ کم　　کہاں ملی ہے کسی کو مثال بیش نہ کم

بہت دنوں سے ہے دل کا عجیب سا عالم　　بہت دنوں سے ہے اس کا خیال بیش نہ کم

کسی کے ہاتھ سے تزئین یار ہے تھے گلاب　　کسی کے لمس کا ہے یہ کمال بیش نہ کم

وہی ایک عالمِ رنگ و بو نہ یہ شب نئی نہ یہ دن نیا　　مرے چار سُو وہی چار سُو نہ یہ شب نئی نہ یہ دن نیا

وہی جبر وجود کے ضابطے وہی سانحے وہی حادثے　　ہے وہی دُرن ہے وہی گلو نہ یہ شب نئی نہ یہ دن نیا

نہ ترا مزاج بدل سکا نہ مرا مزاج بدل سکا　　وہی تیری خُو وہی میری خُو نہ یہ شب نئی نہ یہ دن نیا

بہت مشکل تھا کارِ عشق میں یہ فیصلہ کرنا　　ضروری کیا نہیں تھا اور کیا ہونا ضروری تھا

وہ پتھر ہم نے دانستہ جو اپنے ہاتھ سے پھینکا　　نشانہ جو بھی اپنا تھا خطا ہونا ضروری تھا

میں نے عائشہ کی نظموں کا بھی بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور مجھے محسوس ہوا ہے کہ بہ اعتبار اُسلوب ان کی نظمیں افسانوی دروبست سے پوری طرح لیس ہیں جس کے سبب تاثر تو اتر ہو گیا ہے۔ موضوعات کا تنوع ان کی وسعتِ نظر کا غماز ہے۔ نظم "دھنک" اپنے آہنگ و اُسلوب میں منفرد دکھائی دیتی ہے۔

شب کے آنچل سے لپٹی جھلملاتی زندگی　　سرمئیں پردوں میں چھپتی گنگناتی زندگی

بھیگتے جاتے تھے منظر اُس شب مہتاب کے	مرمریں ترشے سبک سیماب قطرے آب کے
کانپتے جھونکے ہواؤں کے نمی سے چور تھے	اس جہاں کے لوگ بھی ہم سے بہت ہی دور تھے
سرد کمرے کی فضاؤں میں رکی تھی خامشی	ریشمیں پلکوں کی جھالر پر رُکی تھی خامشی
شور کرتی تھی مگر چوڑی کی ہلکی سی کھنک	دیر تک ٹھہری رہی تھی اس کی چاہت کی دھنک

اسی طرح زیر تبصرہ مجموعے میں عائشہ کی کئی شاہکار نظمیں شامل ہیں جو یقیناً عہد آئندہ میں اُن کے بلند مقام کی ضامن ہونگی جب کہ ان کی معاصر نظم گو خواتین میں اُن کے نمایاں مقام و مرتبہ کو دھندلا یا نہیں جا سکتا۔ ثبوت کے طور پر یہاں میں ان کی نظم "میں عورت ہوں" سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

میں عورت ہوں جہانِ ہست کی تفسیر ہوں گویا	تمدن کا نشاں تہذیب کی تصویر ہوں گویا
جبیں وقت پر لکھی ہوئی تحریر ہوں گویا	سلگتی شام کے منظر کا میں روشن ستارہ ہوں

میں اپنا خود سہارا ہوں، میں اپنا خود سہارا ہوں

آخر میں بہترین دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ عائشہ مسعود کا ایک شعر:

ابھی تو ہم نے ترے لفظ چھو کے دیکھے تھے	اک اور عمر گزرتی تو معرفت کرتے

کتاب : چند عصری مسائل

مصنف : ڈاکٹر انیس احمد

مبصر : سید محمد سلیمان

ناشر : منشورات منصورہ، ملتان روڈ۔ لاہور

قیمت : ۲۹۴ روپے

اسلام صرف چند عبادات اور مذہبی رسوم (Rituals) کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ

حیات (Code of life) ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلام ایک جامد اور فرسودہ مذہب نہیں بلکہ ایک فعّال، متحرک اور عملی (Dynamic and practical) دین ہے جو قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات مثلاً توحید، رسالت، ایمان بالآخرت وغیرہ ازل سے ابد تک ایک ہی ہیں۔ ان کے متعلق قرآن مجید اور احادیث میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور کوئی تشنگی باقی نہیں چھوڑی۔ حلال و حرام کے متعلق بھی واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ البتہ بعض امور کو دانستہ اس مصلحت کے تحت چھوڑ دیا گیا ہے کہ علمائے وقت عصری تقاضوں کے مطابق، قرآن و حدیث سے ان مسائل کا استنباط کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے مسائل کا حل تجویز فرما دیتا تو ہوسکتا ہے وہ حل کسی زمان و مکان میں آسان اور قابلِ عمل ہوتا اور کسی زمان و مکان میں اس پر عمل مشکل یا ناممکن ہوتا۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے ماننے والوں میں تفکر اور تدبر کی عادت ڈالنا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو عقل و ''علم الاسماء'' اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمایا ہے وہ اس کو استعمال کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ استنباط و اجتہاد کی ہمت افزائی فرماتا ہے (النسآء:۸۳) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں

''اذا حکم الحاکم فاجتھد ثم اصاب فلہٗ اجران و اذا حکم الحاکم فاجتھد ثم اَخطأ فلہٗ اجر''۔ متفق علیہ

جب ایک فیصلہ کرنے والا اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرتا ہے اگر اس کا فیصلہ درست ہوتا ہے تو اس کے لیے دو ثواب ہیں اور اگر اس سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہوتی ہے تو اس کو ایک ثواب ملتا ہے (بخاری شریف:۷۳۵۲، مسلم شریف:۴۴۸۷)

اجتہاد کے بارے میں البتہ دو باتیں بڑی اہم ہیں۔

☆ اجتہاد صرف ان مسائل میں ہوتا ہے جن کے متعلق کتاب و سنت میں کوئی واضح حکم موجود نہیں

☆ مجتہدین کا اجتہاد وقتی ہوتا ہے۔ دیگر ہم عصر مجتہدین یا بعد میں آنے والے مجتہدین ضروری سمجھیں تو اس کے خلاف فتویٰ دے سکتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب ایسے ہی عصری مسائل کے بارے میں رہنمائی فراہم کرتی ہے جن کے متعلق کتاب و سنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں اور ڈاکٹر انیس احمد صاحب نے ان مسائل کو عام فہم الفاظ اور دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے عوام الناس کے لیے بڑی کام کی باتیں بیان کی ہیں جن میں سے چند اہم قارئین کی معلومات کے لیے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

☆ ایک ایسا کام جو بجائے خود غلط ہو، نیک نیتی اور بالغ نظری کے ساتھ کرنے کے باوجود درست نہیں بن سکتا (ص ۴۴)

☆ مباح کو بلا وجہ حرام کے دائرے میں لے جانا دین کی حکمت کے منافی ہے

☆ نکاح کو اسلام نے ایسے حصار سے تعبیر کیا ہے جو ایک فرد کو نہیں بلکہ ایک پورے خاندان کو فواحش اور فتنے سے نکال کر معروف، بر، حیا اور تقویٰ کے ماحول میں لے آتا ہے۔ نکاح وہ سنت ہے جو ایمان کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ (ص ۱۰۸)

☆ درحقیقت صرف ازدواجی تعلق ایک ایسی ذمہ داری ہے جو شریعت نے ایک بیوی پر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ تمام ذمہ داریاں ایک بیوی کی جانب سے شوہر کے لیے احسان اور صدقے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (ص ۱۳۷)

☆ اگر ایک لڑکی ساتر لباس میں اپنے چہرے اور ہاتھ کو چھوڑتے ہوئے تمام جسم کو ڈھانکے ہوئے ہے تو جس طرح وہ اس حالت میں گھر سے باہر جا سکتی ہے اسی طرح وہ گھر کے اندر ان کے سامنے جن سے اس کا رشتہ بازار میں پھرنے والے افراد کے مقابلے میں مختلف ہے۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے آ سکتی ہے۔ (۸۰)

انشورنس سے متعلق ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔ "لائف انشورنس اور عمومی انشورنس کے ناجائز

ہونے پر بڑی حد تک ہمارے فقہاء کا اجماع ہے" (ص ۲۰۹) یہ بات مجھے بڑی عجیب لگی اس لیے کہ کافی عرصہ پہلے ایک انشورنس ایجنٹ نے مجھے لائف انشورنس کے جواز پر کئی علماء (جن میں غالباً مفتی محمد شفیع صاحب بھی شامل تھے) کے فتوے دکھائے تھے۔ اب معلوم نہیں وہ فتوے اصلی تھے یا جعلی تھے۔ انشورنس کے حق میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اگر ایک بھائی معذور ہو یا بے روزگار دوسرے بھائی اسکی مدد کرتے ہیں۔ اسی طرح بڑے پیمانے پر اگر ایک معاشرے میں کچھ لوگ کمانے کے قابل نہیں یا کسی کا بہت زیادہ مالی نقصان ہو جاتا ہے اور وہ دیوالیہ ہو جاتا ہے تو ایسے لوگوں کی مالی امداد کے لیے معاشرہ فنڈ مہیا کرتا ہے اور یہی انشورنس کا بنیادی اصول ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ عہد رسالت میں دو بھائی تھے ان میں سے ایک ہنرمند تھا اور کماتا تھا جب کہ دوسرے کو کمانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کمانے والے بھائی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے نکمے بھائی کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا "لعلک ترزق بہ" شاید اس کی وجہ سے تم کو رزق دیا جاتا ہو (ترمذی ۲۳۴۵)

مساجد میں خواتین کی شرکت کے تحت ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "خواتین مسجد میں نماز کے لئے اسی وقت آئیں جب ان کے لیے مسجد میں آنا ضروری ہو، مثلاً خطبہ جمعہ، درس قرآن، درس حدیث یا عیدین میں" (ص ۳۸۵)۔ میرے ناقص علم کے مطابق شریعت نے خطبہ جمعہ یا کسی بھی دیگر موقع پر خواتین کے لیے مسجد آنے کو ضروری قرار نہیں دیا۔ عہد رسالت میں خواتین مسجد نبوی میں نماز پڑھنے آتی تھیں لیکن ایسا وہ اپنی مرضی سے کرتی تھیں۔ ان کے لیے ضروری نہ تھا۔ اس کے برعکس آپؐ نے فرمایا "وبیوتھن خیر لھن"۔ ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں (مسند امام احمد ۵۴۴۵، ابوداؤد ۵۶۷) البتہ شریعت نے خواتین کے لیے صرف عیدگاہ جانے کو ضروری قرار دیا ہے۔ اور اس حد تک ضروری کہ اگر کوئی خاتون حائضہ ہے پھر بھی وہ عیدگاہ جائے۔ اگر کسی خاتون کے پاس چادر نہ ہو پھر بھی وہ عیدگاہ جائے۔ چنانچہ حضرت ام عطیہؓ فرماتی ہیں "ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم عیدین کے دن حائضہ عورتوں کو بھی نکالیں اور پردہ نشین لڑکیوں کو بھی نکالیں۔ یہ سب

خواتین مسلمین کی جماعت اور ان کی دعاؤں میں حاضر ہوں البتہ حائضہ خواتین (لوگوں کے پیچھے) نماز کی جگہ سے علیحدہ بیٹھیں (اور لوگوں کے ساتھ تکبیریں کہتی رہیں) ایک عورت نے کہا "یارسول اللہ اگر ہم میں سے کسی کے پاس چادر نہ ہو؟" آپؐ نے فرمایا "اس کی بہن یا ساتھ والی کو چاہیے کہ وہ اپنی چادر میں سے اس کو بھی اڑھا دے" (بخاری شریف ۳۵۱، مسلم شریف ۲۰۵۴ تا ۲۰۵۶) قوسین کے اندر کی عبارت صرف مسلم شریف میں ہے۔

صفحہ ۴۵ پہ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "ایک ایسے قبیلے کی لڑکی کے رشتے کے بارے میں جس میں عموماً لڑکیوں کی آنکھ میں کوئی عیب پایا جاتا تھا حضور نبی کریمؐ نے ایک صحابی کو یہ اجازت دی کہ وہ شادی سے قبل لڑکی کا چہرہ ایک نظر دیکھ لیں۔" ڈاکٹر صاحب کا اشارہ مندرجہ ذیل حدیث کی طرف ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ آپؐ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ وہ انصار کی ایک عورت سے شادی کر رہا ہے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا کیا تم نے اس کو دیکھا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں آپؐ نے فرمایا "جاؤ اور اس کو دیکھ لو اس لیے کہ انصار کی آنکھوں میں کوئی چیز ہوتی ہے" (مسلم شریف: ۳۴۸۵) یہ لڑکی کو دیکھنے کی صرف اجازت نہیں بلکہ حکم ہے۔ اور دوسری حدیث کے مطابق یہ حکم لڑکی میں کوئی عیب ہونے کی صورت میں ہی نہیں بلکہ عام حالات میں بھی ہے۔ چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں میں نے ایک عورت کو رشتے کا پیغام بھیجا تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا تم نے اس عورت کو دیکھ لیا ہے؟" میں نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "تم اسے دیکھ لو یہ تمہارے درمیان نباہ کے لئے زیادہ مناسب ہے" (مسند امام احمدؒ ۱۷۶۸۸، ترمذی ۱۰۸۷، ابن ماجہ ۱۸۶۵، دارمی ۲۱۷۲، ابن حبان ۱۲۳۶، حاکم ۲/۱۶۵، بیہقی ۷/۸۴، طحاوی ۳/۱۴ وغیرہ)

تصویر کے متعلق بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔ "ہماری معروف فقہی کتب میں جو تعریف تصویر کی پائی جاتی ہے، وڈیو پر نظر آنے والی شبیہ پر وہ تعریف چسپاں نہیں ہوتی"

(ص ۲۲۸)۔ اگر ڈاکٹر صاحب یہاں تصویر کی تعریف نقل کردیتے تو تشنگی باقی نہ رہتی۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی اور گورنر مقرر فرماتے وقت اجتہاد کے لیے نص شرعی فراہم کردی۔" (ص ۱۵) یہاں ڈاکٹر صاحب کا ارشارہ مندرجہ ذیل حدیث کی طرف ہے

حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن بھیجا تو فرمایا "جب تم کو کوئی قضیہ پیش آئے تو کس طرح فیصلہ کرو گے۔؟"۔ عرض کیا کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا "اگر کتاب اللہ میں وہ مسئلہ نہ پاؤ؟" عرض کیا سنت رسول اللہؐ سے فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا "اگر سنت رسول میں بھی وہ مسئلہ نہ ملے؟" عرض کیا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور (تلاش حق میں) کوئی کسر نہ چھوڑوں گا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کے سینے پر (اپنا ہاتھ) مارا ور فرمایا "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس بات سے اللہ کا رسول راضی ہے۔" (مسند امام احمد ۲۱۵۰۲، ترمذی ۱۳۲۷، ابوداؤد ۳۵۹۲، داری ۱۶۸)

اس سلسلے میں عرض ہے کہ حضرت معاذؓ کی مندرجہ بالا روایت کو اگرچہ بہت شہرت مل گئی ہے لیکن یہ نہ روایتاً صحیح ہے نہ درایتاً۔ امام ترمذیؒ اسے روایت کرنے کے بعد لکھتے ہیں میرے نزدیک اس کی سند متصل نہیں (ترمذی) ان کے علاوہ سیدنا امام بخاریؒ، امام دارقطنیؒ، عبدالحق اشبیلیؒ، ابن الجوزیؒ، ابن حزمؒ، امام عراقیؒ اور ابن طاہرؒ وغیرہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ (تحفہ یب الترمذی) امام جوزقانیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث باطل ہے۔ (مرقاۃ الصعود، ج ۲، ۱۴۹)

درایتاً یہ حدیث اس لیے صحیح نہیں کہ اس حدیث کے مطابق کسی مسئلے کا حل احادیث میں صرف اُس وقت تلاش کرنا ہے جب وہ مسئلہ قرآن مجید میں نہ ملے۔ لیکن یہ اصول صحیح نہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ (النساء:۲۴)۔ "ان عورتوں کے علاوہ سب عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی سے

ایک ساتھ نکاح کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے صرف دو بہنوں کو جمع کرنے سے منع فرمایا ہے اور پھر کھلی اجازت دے دی ہے۔ اور جب یہ مسئلہ قرآن مجید میں حل گیا تو پھر مندرجہ بالا حدیث کی رو سے یہ مسئلہ سنتِ رسول میں دیکھنے کی کیا ضرورت رہی۔ اس قسم کی مثالیں اور بھی دی جاسکتی ہیں۔

ایک صاحب نے سوال پوچھا ہے ''کیا اسلام میں کسی ایک امام کو لازماً ماننا اور اس کی اتباع کرنا ضروری ہے؟'' (ص ۳۱۹)۔ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ''ضروری ہے'' یا ''ضروری نہیں ہے''۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کا واضح اور دوٹوک جواب دینے کے بجائے کافی لمبی بحث کی ہے۔ بہتر تھا کہ ایک امام کی اتباع کو ضروری سمجھنے کے لیے قرآن مجید کی کوئی آیت یا کوئی حدیث پیش کی جاتی کہ اسلام میں انہی دو چیزوں کو دلیل کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے آیت یا حدیث پیش کرنے کے بجائے ''علماء وفقہاء کے مشورے کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ کیا اس سے اسلام میں پاپائیت کی راہ ہموار نہیں ہوتی؟

اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے ''کیا بیک وقت تمام ائمہ میں سے جس کی جو بات پسند آئے لی جاسکتی ہے۔ مثلاً کچھ باتیں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق اور کچھ باتیں امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق جب کہ تمام ائمہ ایک ہی دین کے پیروکار تھے؟'' (ص ۳۲۰) سوال میں جو لکھا ہے ''جس کی جو بات پسند آئے'' اس سے بطریق حسنِ ظن میں نے یہی سمجھا کہ ''جو بات پسند آئے'' سے سائل کا مقصود یہ ہے کہ ''جو بات اس کی سمجھ کے مطابق قرآن وحدیث سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے اسے پسند آئے۔'' نہ یہ کہ آسان ہونے کی وجہ سے پسند آئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے غالباً دوسری بات کو ہی مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے کہ ''اگر ہر ہر فقہ سے صرف آسان ترین راستے اختیار کر لیے جائیں تو یہ دین کی وسعت کا صحیح استعمال نہ ہوگا۔'' (ص ۳۲۱) جہاں تک میرا خیال ہے کوئی مخلص مسلم ایسی سوچ بھی نہیں سکتا وہ ہر ہر فقہ سے آسان ترین مسئلے تلاش کر کے اختیار کرے۔ اچھا اگر کوئی شخص کسی دوسری فقہ کا ایک یا ایک سے زائد مشکل مسئلے

اختیار کرلے تو اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب کیا فرمائیں گے؟

ص ۳۶۷ پر ایک حدیث کے ترجمے میں یہ الفاظ زائد چھپ گئے ہیں" کیونکہ وہ رحم وکرم کا سرچشمہ ہے"۔ اگر یہ الفاظ تشریح کے طور پر لکھے ہیں تو ان کو قوسین کے اندر لکھنا زیدہ مناسب ہوگا۔ ص ۳۸۴ یہ حدیث الدِّینُ النَّصِیحَۃ بخاری شریف کے حوالے سے نقل کی ہے میرا خیال ہے کہ یہ حوالہ غلط ہے کیونکہ یہ حدیث بخاری شریف میں نہیں بلکہ مسلم شریف میں ہے اس طرح ایک حدیث صفحہ ۴۷ پہ مسلم شریف کے حوالے سے نقل کی ہے۔ یہ حدیث اگرچہ مسلم شریف میں بھی ہے لیکن نقل کردہ الفاظ" واللّٰہ إِنِّی لَأَخشَاکُم لِلّٰہِ وَأَتقَاکُم لَہُ" میری معلومات کے مطابق مسلم شریف میں نہیں۔ یہ الفاظ بخاری شریف کی روایت میں ہیں۔ (بخاری شریف: ۵۰۶۳ و مسلم شریف ۳۴۰۳) البتہ ان سے ملتے جلتے الفاظ" وَاللّٰہِ إِنِّی لَأَرجُو أَن أَکُونَ أَخشَاکُم لِلّٰہِ وَأَعلَمَکُم بِمَا أَتَّقِی" مسلم شریف میں ضرور ہیں لیکن وہ حدیث دوسری ہے جو جنابت اور روزے کے متعلق ہے۔ (مسلم شریف: رقم ۲۵۹۳)

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں مسلم کی روایت ہے کہ" تین چیزوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تم سے بہت خوش ہوتا ہے ایک یہ کہ اسی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ گردانو۔ دوسری یہ کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو۔ فرقے فرقے مت بن جاؤ۔ تیسری یہ کہ جس شخص کو اللہ نے تمہارا صاحب امر بنایا ہے اس کو نصیحت کیا کرو" (ص ۳۸۴)۔ میں نے مسلم میں اس روایت کو کافی تلاش کیا لیکن نہ ملی۔ مسلم کی حدیث ۳۸۸۱ میں تین باتوں کا ذکر تو ہے لیکن اس میں صاحب امر کو نصیحت کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے میری درخواست ہے کہ وہ اگلی اشاعت میں اس کے باب کا حوالہ دے دیں تاکہ مجھ جیسے طلبہ کو تلاش کرنے میں آسانی ہو۔

مجموعی طور پر یہ کتاب عصری مسائل کا بہترین حل پیش کرتی ہے جس کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے بہت مفید ہوگا۔

محمد امین حیدر (شکاگو۔امریکہ)

مزاح نگار حشمت سہیل کا شعری مجموعہ "کرن کرن تبسم"

اردو ادب میں مزاحیہ شاعری کی تاریخ کوئی بہت پرانی نہیں ہے۔اکبر الہ آبادی مرحوم نے اس صنف ادب کو عوامی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔اس قبیلے کے اور بھی کئی بڑے نام ہیں جنھوں نے اس فن کو معتبر بنایا ہے۔مثلاً ظریف لکھنوی، عادل لکھنوی، مجید لاہوری، سید محمد جعفری، ضیاء الحق قاسمی، ضمیر جعفری، دلاور فگار وغیرہ۔موجودہ دور میں خواہ مخواہ حیدرآبادی، انور مسعود، عنایت علی خان، انعام الحق جاوید، اطہر شاہ خاں جیدی، خالد عرفان اور پاپولر میرٹھی وہ نام ہیں جنھوں نے اس فن کے میدان میں قدم رکھا ہے۔حشمت سہیل ان میں ایک منفرد نام ہے۔متذکرہ شعراء میں انکا شمار نو واردی حیثیت سے ہوتا ہے مگر نو آموز نہیں ان کو اپنے فن اور کلام پر مکمل قدرت حاصل ہے۔خواہ وہ واردات قلبی ہوں، حکایات زمانہ ہوں یا لطائف عام۔ان تمام کیفیات اور واقعات کی اس طرح ترجمانی کرتے ہیں جس کی نظیر دوسرے شعراء کے ہاں کم ملتی ہے۔لطائف درکسی قصے کو منظوم کرنا میرے نزدیک ترجمہ نگاری ہی ہے۔نثر کا ترجمہ نثر میں کرنا بڑا آساں ہے مگر کسی نثر کا شعری ترجمہ اور وہ بھی مزاحیہ شعری ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔بقول جون ایلیاء: "ہم نشیں سانس پھول جاتی ہے" شعری ترجمے میں ترسیل معانی کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔حشمت سہیل یہ کام بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔مشتاق احمد یوسفی صاحب نے افتخار عارف کے لیے کبھی کہا تھا کہ "الفاظ اپنی جھل مل دکھا کے اپنا مفہوم بیان کرنے کے بعد ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" یہ بات حشمت سہیل پر پوری طرح صادق آتی ہے الفاظ تو الفاظ یہاں اساتذہ کے شعری کلام کے مصرعے ان کے سامنے اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ حضور مجھ پر گرہ لگایئے۔یہ ان کے فن کی معراج ہے کہ اُن مصرعوں پر یہ اس طرح گرہ

لگاتے ہیں کہ وہ ان ہی کی نظم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح ان کلاسیکی مصرعوں کی نہ صرف یاد تازہ ہو جاتی ہے بلکہ بقول غالب یہ شعر گوئی میں اس کمال تک پہنچ جاتے ہیں جہاں یہ رگ گفتار سے خون جگر کشید کرتے دکھائی دیتے ہیں جہاں تک واقعہ نگاری کا تعلق ہے تو اس فن میں یہ تخلیقی بلندی پر نظر آتے ہیں ان کی شاعری میں جو سہل روانی ہے وہ اس بات کا غماز ہے کہ ان کے یہاں آمد ہے آورد نہیں۔ ان کی زبان اتنی سادہ ہوتی ہے کہ عام آدمی کو اس کا ابلاغ ہوتا ہے۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو　　(انیس)

حشمت سہیل کے مضامین نو کے انبار لگانے کا بہترین وقت نہ ہاتھ روم ہے نہ دفتر۔ ان کا پسندیدہ وقت وہ ہے جب وہ کار چلا رہے ہوتے ہیں۔ ان کا حافظہ اس بلا کا ہے کہ کار سے اترتے ہی وہ تمام نوا ہائے سروش جو انھیں سنائی دی تھیں رقم کرتے ہیں۔ یہ اپنا کام بہت سنجیدگی سے کرتے ہیں اور کلام سناتے بھی سنجیدگی سے ہیں۔ ہنسنے کا کام یہ اپنے سامع پر چھوڑ دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے مشاہدوں اور تجربوں کے علاوہ دوسروں کے تجربوں اور مشاہدوں سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ

اپنی آپ بیتی کے سارے گوشوارے میں　　یکی بات لکھتا ہوں دوسروں کے بارے میں

یہ مزاح سے مسکراہٹیں کشید کرتے ہیں اور پھر ساقی بے خانہ بن کر جام انڈیلتے جاتے ہیں ان کے بے خانے کا ہر رند بلا نوش ہوتا ہے۔ حشمت سہیل سخن کے پردے میں ناگفتنی کو بھی گفتنی بنا دیتے ہیں۔ پڑوسن سے پیار کرنے کی خواہش سر بزم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بیگم بھی ہنس کر ٹال جاتی ہیں کہ "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے" ورنہ بقول ڈاکٹر عابد اللہ غازی ہونا ہوتا کچھ بھی نہیں۔ اس مضمون کی دلچسپی کے لیے مندرجہ ذیل پیراگراف میں حشمت سہیل صاحب کی نظموں کے عنوانات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ کا قصہ ہے کہ سہیل نغمہ بار نے ترانہ اردو گایا اور پاگل پن میں پڑوسن سے پیار جتانے طوطائی شاعروں سے ٹکرانے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ تو بیگم ان کی امریکی سٹیزن نکلیں۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے ایک فقیر کے تجربے سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے ایک پرانی کہاوت کے پردے میں، بیچارے شوہر کی داستان غم سنا کر ان کے گناہوں کی ساری فہرست ان کے سامنے رکھ دی۔ اُنھوں نے اس مقولے پر عمل کرتے ہوئے کہ ہم نے غبارے سے اگلی ساری ہوا نکال دی۔ حشمت صاحب نے بھی کسی چڑیل سے مڈبھیڑ کے ڈر سے شکاگو کے طوفانی مشاعرے ہی پر اکتفاء کیا اور اس طرح وہ کلنک کا ٹیکہ جو لگ سکتا تھا، یہ اس سے بچ گئے۔

میں انھیں ان کی کتاب ”کرن کرن تبسم“ کے اجراء پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور خلوص دل سے دعا کرتا ہوں کہ ”اللہ کرے زور قلم اور زیادہ“

ہم تو شاعر ہیں کر دیتے ہیں دلوں پر دستک — اپنی آواز ہر اک پیر و جواں تک پہنچے

— — — — —

مراسلات

بیرسٹر سلیم قریشی۔لندن۔(برطانیہ)

الاقرباء کا سالنامہ اپنی روایتی خوبیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ سرورق پر فیصل مسجد کا عکس پہاڑ کے دامن میں ابھرتے ہوئے روشن ستارے کی طرح نمایاں ہے۔آپ کا اداریہ'جنوبی ایشیاء میں ادبی میلوں کی یلغار' نے بقول ہمدم دیرینہ محمود اختر سعید مرحوم'ایک کہنہ روایت کو نئی جہت عطا کی ہے۔تہذیبی تصادم کے پس منظر میں آپ نے جن میلے ٹھیلوں کا جائزہ لیا ہے وہ رواں تاریخ کی تلخ حقیقت ہے۔اور آخر میں آپ نے پردہ زنگاری ہٹا کر معشوق کو بے نقاب کر دیا۔بقول اقبال"
'دست بر روی پردۂ محمل گرفت'۔

سالنامہ کے مضامین اور شعراء کا کلام سنہری حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار کا مقالہ"شبلی نعمانی کی شاعری میں ترک اور ترکی" ترکی کی تاریخ اور شبلی نعمانی کی شاعری کا سنگم ہے۔جہاں ہمیں نہ صرف تاریخی واقعات سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ ساتھ ساتھ شبلی نعمانی کی دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ڈاکٹر راہی فدائی کا علامہ اقبال کی نفسیات پر مضمون ایک عمدہ کاوش ہے۔جس میں ڈاکٹر صاحب نے نقاد حضرات کے لیے کچھ اصول تحریر کیے ہیں۔جن پر عمل کر کے وہ اپنے کام کو بحسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ "ہند آریائی تہذیب کا تاریخی پس منظر اور دیومالائی شخصیات" صاحب مضمون کی تحقیقی تحریر کی آئینہ تاریخ میں سچی عکاسی ہوتی ہے۔گوشۂ فیض احمد فیض میں ڈاکٹر یاسمین سلطانہ کا مضمون "فیض احمد فیض کی شاعری میں کرب ذات کا احساس" اور محترمہ رضیہ مشکور کا مضمون'نقش فریادی جذبات وروحانیت کا مجموعہ'فیض کی دیرپا شاعری کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

ادب اور مذہب پر جناب سید سلیمان کی'اسلام اور شاعری'پر تحریر مذہب کے حوالے سے شاعری پر مستند تنقیدی جائزہ ہے۔طنز ومزاح میں جناب سلیم زاہد صدیقی کا اردو ادب کا"ب"

باقاعدہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ صاحبِ مضمون نے نئے قاعدہ کو جو تحریری شکل میں نہیں تھا سیاسی شخصیات اور ان کے کردار کے حوالے سے باقاعدہ تحریری شکل دی ہے۔ اس کو سیاست دانوں کے نصاب میں شامل کرنا چاہیے۔ قاعدہ کے مصنف کو چاہیے کہ اس نئے قاعدہ کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کروالیں ورنہ سیاستدان حسبِ منشاء ترمیم کر کے اپنے نام چھپوا دینگے۔ جناب عقیل دانش کا مختصر و شیریں مقالہ بلا کی شیرینی لئے ہوئے ہے۔ یہ ایک ایسی ہمہ صفت ہستی کا قصہ ہے جس کے ہاتھ میں بقول عقیل دانش تسبیح بھی ستار بھی تلوار بھی رہی ہے۔

یہ سالنامہ اتنا ضخیم ہے کہ تادمِ تحریر اسے پورا نہیں پڑھ سکا۔ ہر عنوان دامنِ دل اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس بات سے دل کو یک گونہ تسکین ہوتی ہے کہ یہ سالنامہ تادیر میرے زیرِ مطالعہ رہے گا۔

امین راحت چغتائی۔ راولپنڈی

مختلف عوارض نے گھیر رکھا ہے۔ ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں آپ قطعی بیمار نہیں ہیں۔ صرف پہلی بار بوڑھے ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ انکشاف بڑا جامعیت کا حامل ہے اس لیے اس موضوع پر مزید گفتگو موقوف۔

البتہ الاقرباء کے تازہ شمارے میں پروفیسر پروین صادق کا مضمون "ثقافت اور مسلمانوں کا ثقافتی ورثہ" بہت اچھا لگا۔ محنت، سلیقے اور واضح طرزِ فکر کا غماز ہے۔ اور بار بار پڑھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر نسیم اے ہاشمی کا "برصغیر میں گنگا جمنی تہذیب کے محرکاتی حوالے" بھی فکر کو مہمیز کا کام دیتا ہے۔ اس میں یہ جان کر بھی اطمینان ہوا کہ مغل شہنشاہ اکبر کے طرزِ حکمرانی کو صحیح تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ ورنہ یار لوگ ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ کو ہی مذکورہ عہد کی اصل تاریخ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ میر تیمور کے عہد کی تاریخ کو ابن عرب شاہ نے مسخ کیا اور اکبر کے عہد کی تاریخ کو ملا عبدالقادر بدایونی نے۔ حالانکہ ہم بھی جانتے ہیں کہ تاریخ کوئی مقدس شے نہیں ہوتی۔ اسے اچھا یا بُرا تاریخ نویس کا زاویہ نظر بناتا ہے۔ تاہم تاریخ کے تجزیہ نگاروں کی بھی کمی نہیں وہ اسے کسی نہ کسی وقت درست کر ہی دیتے ہیں۔

ادبی میلوں پر آپ کا اداریہ پڑھا تو محسوس ہوا کہ آپ کچھ کہتے کہتے رُک گئے ہیں۔ حالانکہ یہ تو وہ موضوع ہے جس میں آپ کی جولانیٔ طبع دیدنی ہوتی ہے۔ چلئے یوں ہی سہی، اللہ آپ کو ہنسائے بسائے رکھے۔

صابر عظیم آبادی۔ کراچی

الاقرباء کا سالنامہ ۲۰۱۱ء موصول ہوا۔ دیکھتے ہی طبیعت خوش ہوگئی۔ بہت ہی بھاری بھر کم، دیدہ زیب اور خوبصورت ہے۔ شمارے کے تمام مضامین بڑے اچھوتے ، معیاری اور معلوماتی ہیں۔ مضامین کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔ ان میں بیشتر مضامین تحقیقی ہیں۔ قلمکاروں نے اپنے مضامین تیار کرنے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہوگا دیگر مضامین بھی اچھے اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ میں نے ابھی تک جن مضامین کا مطالعہ کیا ہے ان میں محمد انور حسین زبیری مجددی کا مضمون ''شاعر تصوف و معرفت۔ خواجہ میر درد'' ڈاکٹر تسیم اے ہائنز کا ''برصغیر میں گنگا جمنی تہذیب کے محرکاتی عوامل'' پروفیسر پروین صادق کا ''ثقافت اور مسلمانوں کا ثقافتی ورثہ'' شفق ہاشمی کا مضمون ''ہند آریائی تہذیب کا تاریخی پس منظر اور دیومالائی شخصیات'' قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام مضامین اچھے ہیں۔ حمد و نعت۔ نظم و غزل کا حصہ جاندار اور معیاری ہے۔ نقد و نظر میں آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔

سلمان غازی۔ ممبئی (انڈیا)

الاقرباء کا سالنامہ موصول ہوگیا۔ الاقرباء میں تمام مضامین اس قدر اچھے اور موضوعات میں اس قدر تنوع ہوتا ہے کہ رسالہ ایک نشست میں پڑھے بغیر نہیں رہا جاتا۔ ایسے معیاری پرچے اب اردو میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اکثر نے تو حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہے جس کے سبب معیار سے سمجھوتہ کرنا ناگزیر ہے۔ آپ کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان حالات میں آپ نے معیار کے ساتھ سمجھوتہ کرنا گوارا نہیں کیا۔

سید حبیب اللہ بخاری ۔ بہاولپور

سہ ماہی الاقرباء (سالنامہ ۲۰۱۱ء) موصول ہوا۔ میں نے بہ عجلت مطالعہ کی کوشش کی کیونکہ میں اللہ کے فضل و کرم سے عمرہ کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔

آپ نے اپنے اداریہ میں جو اندوہناک انکشافات کیے ہیں خدا کرے ہمارے دانشور اور صاحبانِ علم و بصیرت اس کا ادراک کریں تاکہ بین الاقوامی طور پر اس خطۂ پاک کے بارے میں منفی تصورات کا ازالہ ہو سکے۔

مضامین و مقالات بڑی تحقیق اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ بلاشبہ ان کے مطالعہ سے مقالہ نگار حضرات کی وسعت علم و فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مزید علمی بصیرت عطا کرے اور خدمتِ انسانیت کا جذبہ عطا کرے اور ہماری نسلِ نو کو ان گنج ہائے گرانمایہ سے فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اس دورِ قحط الرجال میں جب کسی اہل دانش کے سانحۂ ارتحال کا علم ہوتا ہے تو پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ جناب عاصی کرنالی، ڈاکٹر وزیر آغا، اے حمید اور محمود اختر سعید کی رحلت نے نہ صرف مغموم کر دیا بلکہ ان حضرات کی موجودگی ہمارا علمی سرمایہ تھی جس سے ہم محروم ہو گئے۔ خدا تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

سیدہ تزئین حضور کی کامیابی بلکہ اول پوزیشن کی خبر پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی میری طرف سے "پوتی" کی کامیابی پر مبارکباد قبول کیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری پوتی اوّل آئی ہے اور وہ بھی علم ہندسہ میں۔ والسلام الاکرام!

شمع سیّد ۔ لاہور

الاقربا کا سالنامہ دیکھا اور پڑھا ادب کی دنیا میں مجھ جیسی نوآموز اور ناتجربہ کار طالبہ کے لیے اس کی تعریف و توصیف احاطہ تحریر میں لانا ممکن ہی نہیں ہے آپ نے سچ مچ دریا کو کوزے

میں بند کر دیا ہے۔ ہر تحریر ہر مضمون بے مثال ہے۔ علم اور ادب کے رنگوں سے مزین الاقربا پڑھنے بیٹھو تو انسان پوری طرح علمیت اور جامعیت میں ڈوب جاتا ہے۔ ''اقبالیات'' میں علامہ محمد اقبالؒ کے بارے میں جو مضامین پڑھنے کو ملے ان میں الگ ہی اقبال نظر آئے۔ ہم جیسے عام قاری جو اقبال کی شخصیت سے متعلق اتنی باریک بینی سے نہیں جانتے اُن کے لیے یہ مضامین کسی نعمت سے کم نہیں۔ تعلیم اور تعلّم، آئینہ تاریخ، ادب اور مذہب اسلام اور شعر و شاعری کے گوشوں میں تحقیق اور علم سے بھر پور مضامین تھے۔ گوشۂ رفتگاں میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے متعلق تمام احباب نے مختلف انداز میں اپنی اپنی یادیں تازہ کیں۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب کی تحریر میں ایک افسانوی رنگ تھا۔ جس طرح انہوں نے اپنی ملاقات کی منظر نگاری کی وہ بے مثال تھا۔ یہ یقیناً اُن جیسے بڑے فنکار کا ہی وصف ہے۔ غزل میں امین راحت چغتائی، صوفیہ انجم تاج، پروفیسر حسن عسکری کاظمی اور پروفیسر زہیر کنجاہی کی غزلوں نے متاثر کیا۔

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کے لئے)

احوال و کوائف

○ مجلس عمومی کا پندرھواں سالانہ اجلاس:

حسب روایت مجلسِ عمومی الاقرباء فاؤنڈیشن کا پندرھواں سالانہ اجلاس مورخہ ۲۳ اپریل ۲۰۱۱ء بروز ہفتہ ساڑھے پانچ بجے شام سرسید میموریل آڈیٹوریم واقع ۱۹ اتاترک ایونیو جی ۵/۱ میں منعقد ہوا۔ ممبران نے اپنے اہل خانہ و مہمانان گرامی کے ساتھ اس میں شرکت کی۔ اجلاس کا آغاز تلاوت قرآن پاک اور نعت شریف سے ہوا۔ یہ اجلاس دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا حصہ فاؤنڈیشن کی سالانہ کارکردگی اور دوسرا حصہ ثقافتی پروگرام کے حوالے سے تھا۔ جس میں شرکاء نے بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا اور انعامات جیتے۔ اس کے بعد تعلیمی شعبہ میں بہترین کارکردگی کے حامل طلباء و طالبات کو اعترافی شیلڈ اور انعامات سے نوازا گیا۔ اجلاس کا دوسرا حصہ سہ ماہی الاقرباء کے دس سال (۲۰۰۱ء-۲۰۱۰ء) مکمل ہونے پر ''خصوصی تقریب'' پر مشتمل تھا۔ اس تقریب کو دنیائے علم وادب کی مشہور و معروف شخصیات نے رونق بخشی۔

○ آنسہ ملیحہ سالاری کا اعزاز:

ہر سال مجلس عمومی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر تعلیمی شعبہ میں بہترین کارکردگی کے حامل طلباء و طالبات کو ''سید آفتاب احمد ایوارڈ'' سے نوازا جاتا ہے۔ اس سال یہ ایوارڈ جناب و بیگم سید مزمل اللہ سالاری ممبر الاقرباء فاؤنڈیشن کی صاحبزادی آنسہ ملیحہ سالاری نے حاصل کیا۔ ادارہ اس خوشی کے موقع پر انہیں اور اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

○ ثانوی سطح تک تعلیمی شعبہ میں انعامات حاصل کرنے والے طلباء و طالبات:

عبید اللہ جان خان، سیدہ ماہ نور فاطمہ، طلیبہ خالد، سیدہ ثمر فاطمہ، رفتان جان اطہر، سیدہ عروسہ فاطمہ اور علیبہ سلمان۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء ان تمام بچوں کو بہترین کارکردگی پر دلی تہنیت پیش کرتے ہوئے مستقبل میں مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

○ سعادت عمرہ پر مبارکباد:

ماہ اپریل ۲۰۱۱ء میں جناب سید محمد حسن زیدی سابق سیکریٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن سعادتِ عمرہ سے مشرف ہوئے۔ وہاں ان کا قیام پندرہ روزہ تھا جس کی ایک ایک گھڑی انہوں نے مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی زیارتوں کے درمیان گزاری اور ادائیگی عمرہ کے بعد شاداں و فرحاں وطن عزیز تشریف لائے۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء اور اراکین فاؤنڈیشن اس سفر سعید اور مبارک و باسعادت موقع پر انہیں اور اہل خانہ کو دلی تہنیت پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔

○ جناب افتخار عارف کے اعزاز میں پروقار تقریب:

مورخہ ۱۴ مئی ۲۰۱۱ء بروز ہفتہ صدر محترم الاقرباء فاؤنڈیشن سید منصور عاقل صاحب نے اپنی رہائش گاہ پر جناب افتخار عارف سابق چیئرمین "اکادمی ادبیات پاکستان" کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی۔ یہ ایک غیر رسمی لیکن نہایت ہی خوبصورت و پروقار محفل تھی کہ اس میں مہمانانِ گرامی کے علاوہ اراکین مجلس منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن اور وہ ممتاز و نامور شخصیات مدعو تھیں جو شعبۂ درس و تدریس اور دنیائے شعر و ادب سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں۔ جسٹس شاہد صدیقی صاحب، محترم حبیب الوہاب الخیری صاحب، سلیم زاہد صدیقی صاحب، جناب عامر شادانی، ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، سید حسن زیدی صاحب، بریگیڈیئر جناب اقبال شفیع سید محمد سلیمان صاحب، شریف فاروق صاحب، اختر وقار عظیم صاحب، جناب طارق محمود و بیگم

طارق محمود صاحب، عبدالستار نعیم صاحب و جناب اصغر حسین سبزواری۔ جناب صدر نے محفل کا آغاز کرتے ہوئے تمام شرکائے تقریب کا مہمانِ خصوصی سے فرداً فرداً تفصیلی تعارف کرایا۔ ازاں بعد نہایت ہی بے تکلفی کی فضا میں تمام حضرات و خواتین نے شعروادب کے حوالے سے بڑی پُرمغز اور معلومات افزاء گفتگو کی۔ آخر میں جناب افتخار عارف نے اپنے ادبی سفر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح ان کا ''شوق ادب وسیلۂ معاش'' بن گیا اور وہ ''اکادمی ادبیات پاکستان'' سے منسلک ہو گئے۔ گذشتہ دنوں وہ بحیثیت صدر نشین مقتدرہ قومی زبان اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ لیکن ادب سے ان کا رشتہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ آخر میں انہوں نے اپنے کلام سے منتخب غزلیں اور نظمیں سنائیں جن کو سب نے بہت پسند کیا۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ انہیں وہ سب ازبر تھیں۔ تقریباً ۹ بجے شب پرتکلف عشائیہ اور گروپ فوٹوگرافی پر اس خوبصورت محفل کا اختتام ہوا۔ جناب افتخار عارف نے جناب منصور عاقل، تمام مہمانانِ گرامی اور اہلِ خانہ کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت چاہی۔

○ تعلیمی شعبہ میں اعلیٰ کارکردگی:

ممبر مجلس منتظمہ محترمہ طیبہ آفتاب صاحبہ کی نواسی، دختر میجر جنرل جناب اختر وحید و بیگم نائلہ وحید نے اس سال ایم بی بی ایس فرسٹ ایئر کا امتحان ۷۹ فیصد نمبروں کے ساتھ پاس کیا ہے جب کہ گروپ میں ان کی 8th پوزیشن ہے اور دو مضامین میں ان کی Distinction ہے۔ ادارہ سہ ماہی اس کامیابی پر انہیں اور جملہ اہلِ خانہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے مستقبل میں مزید کامیابیوں کے لیے دعاگو ہے۔

☆ سیدہ ام منصور ہونہار پوتی ہیں جناب و بیگم سید منصور عاقل کی اور صاحبزادی ہیں جناب و بیگم سید فیصل منصور ممبر الاقرباء فاؤنڈیشن کی۔ انہوں نے نرسری کلاس اعلیٰ ترین اعزاز کے ساتھ پاس کی ہے۔ یہ تمام نرسری گروپس میں اوّل رہی ہیں اور یوں Best Student of Narsary کلاسز کے ایوارڈ کی حقدار ٹھہریں۔ لاہور گرامر اسکول کی بہترین طالبات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

ادارہ سہ ماہی اس پر مسرت موقع پر انہیں اور اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مستقبل میں انہیں ایسی مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ آمین۔

☆ اور یہ ہیں ترئین منصور۔ یہ بھی صدر محترم و بیگم صاحبہ کی لائق و فائق پوتی اور جناب و بیگم فرحان منصور ممبر الاقرباء فاؤنڈیشن کی صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے لاہور گرامر اسکول سے کلاس پنجم گریڈ "A" میں پاس کیا ہے۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء انہیں اور جملہ اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مستقبل میں مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

☆ جناب صدر کے ایک اور پوتے سید احسن منصور ہیں جو صاحبزادے ہیں جناب و بیگم سید فیصل منصور کے۔ انہوں نے بھی لاہور گرامر اسکول سے اس سال کلاس دوئم گریڈ "A+" کے ساتھ پاس کیا ہے۔ ادارہ سہ ماہی انہیں بھی ڈھیروں مبارکباد دیتے ہوئے آئندہ بھی اعلیٰ ترین کامیابیوں کی دعائیں دیتا ہے۔

☆ بیگم و جناب منصور عاقل کے اکلوتے نواسے عزیزی دانیال نے جو ایک ممتاز ترین درس گاہ روٹس سکول سسٹم کے طالب علم ہیں کلاس I کے امتحان میں غیر معمولی اور قابل رشک کامیابی حاصل کی ہے انھوں نے تمام نصابی مضامین میں مجموعی طور پر ۹۲ % مارکس حاصل کرکے ہر مضمون میں انفرادی طور پر گریڈ A-I کا اعزاز پایا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں نو (۹) عدد ایوارڈز اور ایک سرٹیفکیٹ بھی "Root,International primary programme" کے تحت عطا کیے گئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

(1) Mathimatical Wizard Award (2) Creative Artist Award (3) Literary skills Award (4) Self Directions Skills Award (5) Excellent Speller Award (6) fluent Reader Award (7) Best Project Award (8) Reading Award (9) 'I do my R.A. Regularly ' Award (10) Certificate of Participation.

ادارہ ان کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

رپورٹ

شہلا احمد

الاقرباء فاؤنڈیشن کا پندرھواں سالانہ اجلاس

جیسا کہ ہم سب کے علم میں ہے الاقرباء فاؤنڈیشن ہر سال مجلس عمومی کے ممبران کے لیے سالانہ اجلاس کی شکل میں آپس میں ملاقات، گفت و شنید کا موقع فراہم کرتی ہے، جس کا دوسرا اہم مقصد ممبران کو فاؤنڈیشن کی سالانہ کارکردگی سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ مورخہ ۲۳ اپریل ۲۰۱۱ء

بروز ہفتہ اس حوالے سے مجلس عمومی کا پندرھواں سالانہ اجلاس حسب سابق سرسید میموریل واقع ۱۱ اتاترک ایونیو سیکٹر جی ۵/۸ کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ جس میں ممبران نے اپنے اہل خانہ، عزیز و اقارب اور احباب کے ساتھ شرکت کی۔

یہ اجلاس تقریب کے لحاظ سے دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصہ میں حسب روایت فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ممبران کی ضیافت طبع کا خیال رکھتے ہوئے کئی تفریحی، معلوماتی، ادبی اور ثقافتی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تقریب کا دوسرا حصہ مجلہ سہ ماہی الاقرباء کے دس سال ۲۰۰۱ تا ۲۰۱۰ء مکمل ہونے کے حوالے سے "خصوصی تقریب" تھا جسے دنیائے ادب کی مشہور و معروف شخصیات نے رونق بخشی۔
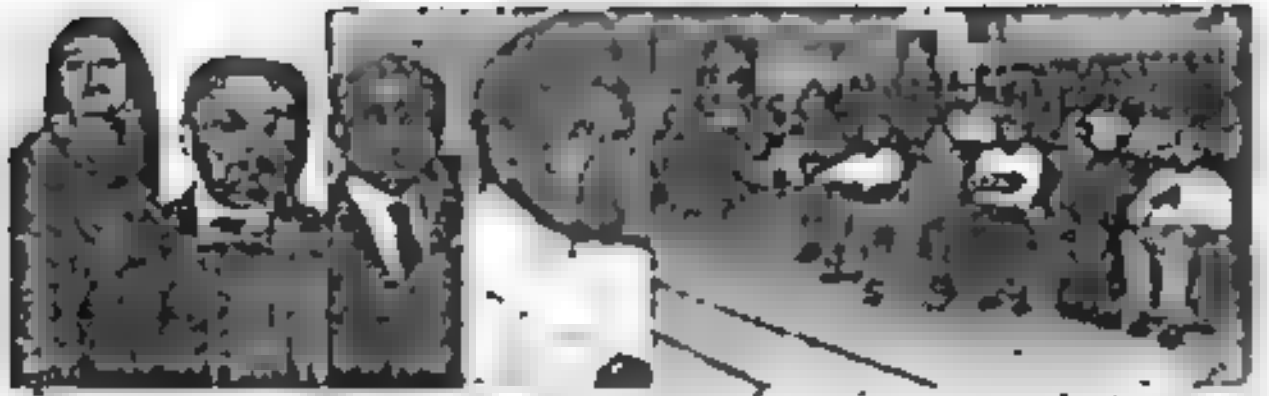
سالانہ اجلاس کے سامعین اور مقررین (دائیں سے بائیں) محترمہ ہما مرزا سالاری، سید محمد حسن، ڈاکٹر محمد ایوب علوی اور سید منصور عاقل

ڈپٹی سیکریٹری الاقرباء فاؤنڈیشن محترمہ ہما مرزا سالاری نے صدر محترم جناب سید منصور عاقل، سینئر نائب صدر جناب جی ے صابری، نائب صدر شہلا احمد (راقم الحروف) اور سیکریٹری جنرل ڈاکٹر محمد ایوب علوی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔

تقریب کا آغاز زیر صدارت صدر محترم سید منصور عاقل صاحب ہوا۔ محترمہ ہما سالاری نے صدر محترم کی اجازت سے اجلاس کی باقاعدہ کارروائی شروع کرنے کا اعلان کیا۔ عزیزی عامر بن خالد نے تلاوت قرآن حکیم کی سعادت حاصل کی۔ جب کہ جناب محمد حسن زیدی سابق سیکریٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن نے اپنے کلام سے منتخب نعت نہایت دلکش انداز میں پیش کی۔ ۔۔ازاں بعد سیکریٹری جنرل جناب محمد ایوب علوی نے سال گزشتہ کی رپورٹ، میزانیہ اور سال بھر کی کارکردگی کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان تمام فلاحی اور تعلیمی و تفریحی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کیا جو فاؤنڈیشن وقتاً فوقتاً انجام دیتی رہتی تھی۔ اس کے بعد ممبران سے تجاویز و آراء طلب کرتے ہوئے عام بحث کی دعوت دی گئی اور یوں یہ مرحلہ بحسن و خوبی طے پا گیا۔ بعد ازاں صدر محترم کو اجلاس سے خطاب کی دعوت دی گئی۔ جناب صدر نے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے تمام ممبران و مہمانانِ گرامی کو خوش آمدید کہا۔ آپ نے فاؤنڈیشن کی کارکردگی کے حوالے سے اس سے وابستہ تمام شخصیات و ممبران کے بے لوث تعاون و بے غرض خدمات کو بہت سراہا۔ آپ نے سہ ماہی الاقرباء کے حوالے سے خاص طور پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان تمام شہرۂ آفاق قلمکاروں، مصنفین اور دانشوروں کی توصیف و ستائش کی جن کی خوبصورت و فکر انگیز نگارشات نے اس مجلہ کو عالمی سطح پر

ایک اعلیٰ و ارفع مقام دلانے میں مدد کی۔ آخر میں صدر محترم نے ایک بار پھر محترم مہمانانِ گرامی اور شرکائے اجلاس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ادارہ کی سلامتی و ترقی کے لیے دعا کی۔

صدر کے خطاب کے ساتھ ہی معمول کی کارروائی اختتام پذیر ہوئی اور پروگرام کے دوسرے حصہ "ثقافتی پروگرام" کا آغاز ہوا۔ تمام شرکاء نے پرجوش تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس سلسلے کا پہلا آئٹم حسبِ معمول فینسی ڈریس شو" تھا۔ جسے حسین و خوش رنگ بنایا گیا تھا ممبران کے تین سے آٹھ سال تک کے بچے خوبصورت کرداروں کا روپ دھار کر اسٹیج پر آئے۔ میزبانی کے فرائض راقم الحروف کے سپرد تھے۔ ابھی میں نے ان حسین پھولوں کا تعارف شروع ہی کیا تھا کہ ہال ایک بار پھر زوردار تالیوں سے گونج اٹھا۔ مقابلے کے شرکاء نہایت اعتماد سے شہلا حسن زیدی، سارہ سلمان اور لبنیٰ مدثر کی رہنمائی میں اسٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب کہ ان کی مائیں ان کی

[illegible]
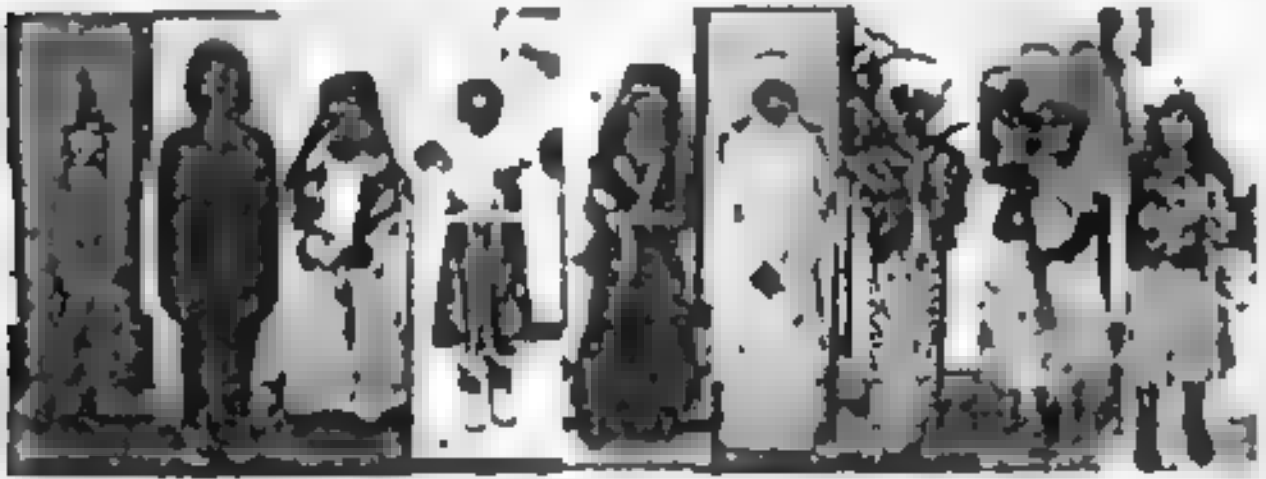
ہمت افزائی اور مورال بلند کرنے کے لیے قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھیں۔ سب سے آگے تھے 'جوکر میاں' پولکا ڈاٹ کا ڈریس، ڈل رنگ کے بڑے بڑے شوز، مخروطی کون کیپ لمبے بالوں کی جھالر کے ساتھ، لال موٹی سی گول ناک، سفید دستانے، دونوں بازوؤں میں Juggling rings، چہرہ پر سفید چاند اور آنکھوں پر کالی کالی لائنیں یہ تھیں حیا اطہر۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ان کی ماما نے انہیں مکمل جوکر کا روپ دینے کے لیے۔ انہیں دیکھتے ہی پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ان کے بعد نمودار ہوئے "گل سورج مکھی" سبز چمکیلے لباس میں ملبوس، چہرہ پر بڑا سا

سورج مکھی کا پھول، منہ کو براؤن جالی سے چھپایا ہوا۔ ہاتھوں میں دو چھوٹے چھوٹے سورج مکھی کے پھول، یہ تھیں حریم اطہر، ان پر بھی بڑی محنت ہوئی تھی۔ لگ رہا تھا سچ مچ کا سورج مکھی کوئی ہال میں لے آیا ہے۔ بڑا پسند کیا ان کو بھی سب نے۔ خوب خوب تالیاں بجیں اور داد و تحسین لی۔ اور پھر تشریف لائیں چھوٹی سی پیاری سی دلہن۔ نیلے اور گلابی رنگ کے فرشی غرارہ سوٹ میں ملبوس، سر گوٹے کناری سے سجے دوپٹے سے ڈھکے، پیشانی پر گولڈن ماتھا پٹی، گلے میں سونے کا سیٹ، ناک میں نازک سی چین والی نتھ، کانوں میں بڑے بڑے بندے۔ ہاتھوں میں مہندی اور کلائیاں خوبصورت چوڑیوں سے بھری ہوئیں ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں کاجل۔ سب ہی کچھ تو تھا ان کے پاس ایک پیاری سی دلہن کا روپ دھارنے کے لیے۔ شرماتی لجاتی جب یہ اسٹیج پر آئیں تو بڑا ہی پسند کیا سب نے۔ اور دل کھول کر داد دی طیبہ خالد کو۔ ہاں یہ ہی تو تھیں دلہن۔ اور ان کے بعد تشریف لائے عرب کے شیخ۔ سفید رنگ کی توپ پہنے ہوئے سر پر لال سفید چوخانہ رومال جس پر سیاہ رنگ کا بینڈ لگا ہوا۔ فرنچ کٹ داڑھی، آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگائے اور ہاتھ میں تسبیح پکڑے۔ بڑے ہی پیارے لگ رہے تھے۔ ریحان بن خالد اپنے اس گیٹ اپ میں۔۔ بہت پسند کیا ان کو بھی سب نے اور بہت سی تالیوں کی گونج میں انہیں خوب خوب داد دی۔ اور اب باری تھی میاں کسان کی۔۔ چیک دار دھوتی پر سفید رنگ کی جیبوں والی بنڈی پہنے، گلے میں تعویز اور سر پر پگڑی۔ بڑے ہی پیارے لگ رہے تھے حارث منصور۔۔ اور کالی کالی مونچھوں نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔ اور رہی سہی کسر پوری کر دی تھی ہاتھ میں پکڑی درانتی اور کندھے پر اٹھائے گھاس کے گٹھے نے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی کھیت سے فصل کاٹ کر آ رہے ہیں۔ ان کا استقبال بھی پر جوش تالیوں سے ہوا۔۔۔ اور کسان کے بعد ظہور ہوا معصوم سے فرشتہ کا۔ سفید میکسی میں ملبوس سفید ہڈ (Hood) لگائے علینہ سلمان معصوم فرشتہ ہی لگ رہی تھیں۔ گھلے پر یہ تاثر دے رہے تھے کہ جیسے ابھی ابھی آسمان سے زمین پر اُتری ہیں۔ بہت پسند کیا انہیں بھی سب نے زور دار تالیوں سے اظہار پسندیدگی کیا۔ فرشتہ کے پیچھے تھا ایک پھول۔۔ گلابی فراک، گلابی شوز، سر پر

گلابی پھولوں کا ہار اور ہاتھ میں گول بال نما پھولوں کا گچھا۔ یہ تھیں زرقا فاطمہ پھول کے گیٹ اپ میں۔ یہ بھی بڑی پیاری لگ رہی تھیں ان کا استقبال بھی تالیوں کی گونج میں ہوا۔ اور پھر اچانک ہی کہیں سے اسپائڈرمین آگئے۔ بلو اور سرخ Spider Web کے ساتھ سر پر اسپائڈر ماسک لگائے، اکرام اللہ سالاری حقیقی اسپائڈرمین لگ رہے تھے۔ ان کا استقبال بھی تالیوں سے کیا گیا۔ اور آخر میں اسٹیج پر آئیں ثمرہ فاطمہ سالاری مالن کے گیٹ اپ میں پھولوں سے بھری ٹوکری اٹھائے بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ ان کو بھی سب نے بہت پسند کیا یہاں یہ آئٹم اختتام پذیر ہو۔ یوں تو مقابلہ میں شریک ہر بچے کو "انعام برائے حوصلہ افزائی" سے نوازا گیا۔ لیکن محترم منصفین کے فیصلہ کے مطابق عربی شیخ (ریحان بن خالد) اوّل انعام، سونے مکھی (حریم طاہر) دوئم انعام اور کسان (حارث منصور) سوئم انعام کے حقدار ٹھہرے۔

فینسی ڈریس شو کے بعد اگلے آئٹم "مزاج شناسی" کا آغاز ہوا جسے ہوسٹ کیا آسیہ بالہ صابری نے۔ اس سلسلے میں جوڑوں کو دعوت دی گئی وہ تھے، سید مدثر اللہ سالاری و بیگم لبنیٰ سالاری جناب سید سلمان منصور و بیگم سارہ سلمان اور اطہر اسلام احمد و بیگم مریم اطہر۔ بالہ صابری نے تینوں جوڑوں کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی اور اس کے بعد باری باری تینوں جوڑوں سے ان کے دوسرے ساتھی کی غیر حاضری میں سوالات کئے۔ جو نہایت دلچسپ و مزاح سے بھرپور تھے۔ تینوں جوڑوں سے جو سوالات کئے گئے ان کے بیشتر جوابات سے بہترین ذہنی ہم آہنگی اور مکمل مزاج شناسی کا
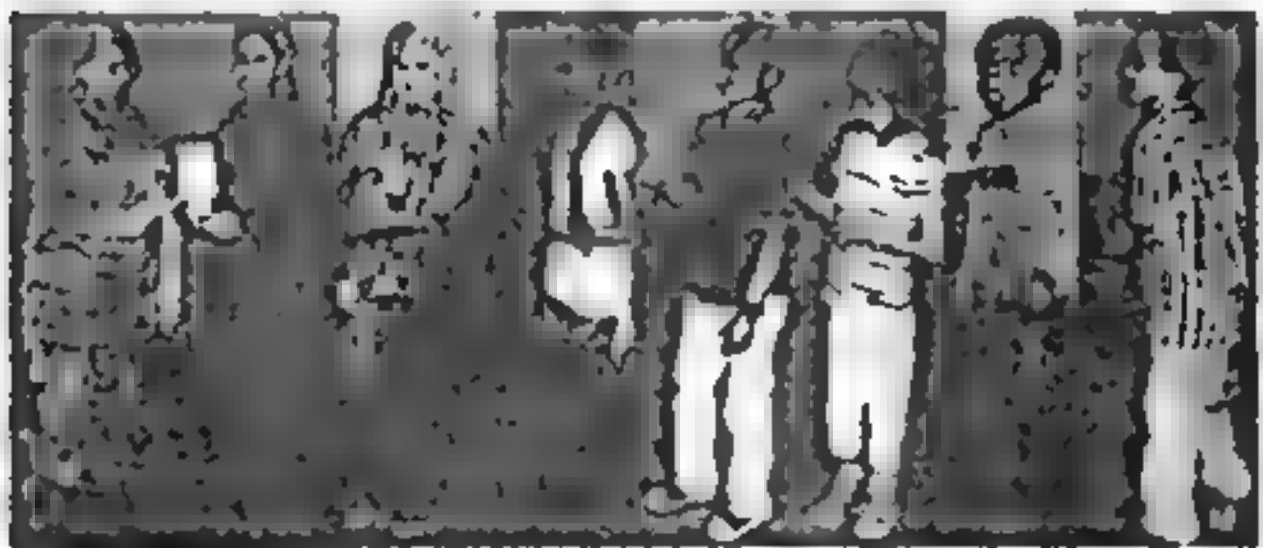
محترمہ بیگم حبیب تاب طفل ستاروں میں شرکا کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں

تاثر ملا چنانچہ تینوں جوڑے کامیاب قرار دیئے گئے اور تینوں انعامات کے حقدار ٹھہرے۔ محترمہ طلیعہ آفتاب صاحبہ نے مجلسِ انتظامیہ کی طرف سے انہیں انعامات سے نوازا۔

'مزاج شناسی' کے ساتھ ہی دوسری طرف اسٹیج پر ہی مقابلہ 'سلاد سازی' جاری تھا۔ مقابلہ کے صرف دو ہی شرکاء تھے ایک تھیں مریم اطہر۔ اور دوسری تھیں سارہ سلمان۔ بہت ہی خوبصورتی سے سجائے تھے دونوں نے اپنے اپنے سلاد۔ اور مزہ۔ وہ بھی دوبالا۔ اس مقابلے کی منصفین تھیں۔ ممبر مجلسِ انتظامیہ محترمہ ماریہ صابری صاحبہ اور محترمہ لبنیٰ مدثر صاحبہ۔ ان کے فیصلہ کے مطابق دونوں شریک خواتین انعام کی حقدار تھیں۔۔۔۔ سارہ سلمان نے یہ پالا مارلیا۔ چنانچہ وہ اوّل انعام جب کہ مریم اطہر دوئم انعام سے نوازی گئیں۔ یہ انعامات بھی بیگم طلیعہ آفتاب صاحبہ نے انہیں دیئے۔

اس کے بعد ایک اور دلچسپ مقابلہ شروع ہوا اور یہ تھا ''مقابلہ شیر خوری'' اس میں نوجوان بچوں نے حصہ لیا۔ یہ پیشکش تھی محترمہ نعیم فاطمہ علوی ممبر مجلسِ انتظامیہ کی۔ اس مقابلے کے شرکاء تھے۔ محمد فائز حسن اور ان کے دو دوست۔ رمان جان اطہر، عامر بن خالد اور عبداللہ جان خالد۔ میں مقابلہ میں عامر بن خالد اوّل اور رمان جان اطہر دوئم رہے۔

پروگرام کا اگلا آئٹم ''ذہنی آزمائش'' کا تھا جس میں تحریک پاکستان کے حوالے سے سوالات لکھے گئے تھے۔ جس میں بچے بڑے سب ہی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسے پیش کیا تھا جناب سید محمد حسن زیدی نے جب کہ کنزہ ناظم نے ان کی معاونت کی۔ جناب حسن زیدی اور کنزہ ناظم صحیح جواب آنے پر انعام سے نوازتے اس مقابلے میں جن شرکاء نے انعام جیتے ان کے نام ہیں۔ اریبہ تکلیذ، طیبہ فاطمہ، مریم اطہر، عامر بن خالد، وردہ شیخ اور عثمان احمد۔

سالانہ اجلاس مجلسِ عمومی کا آخری لیکن نہایت اہم و دلکش مرحلہ تقسیم انعامات برائے اعلیٰ تعلیمی کارکردگی تھا۔ یہ انعامات ہر سال سالانہ اجلاس کے موقع پر تعلیمی شعبہ میں غیر معمولی کارکردگی کے حامل طلباء و طالبات کو دیے جاتے ہیں جس کا آغاز سید آفتاب احمد (مرحوم) ممبر

مجلس انتظامیہ نے کیا تھا۔ یہ سلسلہ جس کا اہتمام اب بیگم علینہ آفتاب صاحبہ کرتی ہیں آج بھی "سید آفتاب احمد ایوارڈ" کے نام سے برقرار ہے۔ اس سال اس ایوارڈ کی اعترافی شیلڈ سیدہ علیحہ سالاری دختر جناب و بیگم سید مزمل اللہ سالاری رکن مجلس انتظامیہ کو بورڈ سے کلاس ہشتم ۹۴ فیصد مارکس کے ساتھ گریڈ "A+" میں پاس کرنے پر دی گئی۔ تعلیمی شعبہ میں ایک اور انعامی سلسلہ جس میں اسکول لیول کے بچوں کو اس دفعہ ممبران مجلس انتظامیہ کی طرف سے انعامات سے نوازا گیا۔ اس سلسلے کا پہلا انعام عبید اللہ جان فرزند جناب و بیگم جمیل ناصر خان نے کلاس پنجم میں ۹۴ فیصد نمبروں کے ساتھ پاس کرنے پر حاصل کیا۔ ماہ نور فاطمہ دختر جناب و بیگم سید منور عالم بھی کلاس پنجم میں ۹۴ فیصد نمبروں کے ساتھ پاس کرنے پر اوّل انعام کی حقدار ٹھہریں۔ اس انعام کی اگلی حقدار طیبہ خالد کلاس دوم ۹۴ فی صد نمبروں کے ساتھ پاس کرنے پر ٹھہریں۔ سیدہ ثمر فاطمہ سالاری دختر جناب و بیگم سید مدثر اللہ سالاری نے کلاس اوّل ۵. ۹۳ فیصد کے ساتھ پاس کرکے انعام حاصل کیا۔ اگلا انعام رمان جان اصہر فرزند جناب و بیگم اطہر اسلام احمد نے کلاس پنجم ۸۵ فیصد نمبروں کے ساتھ پاس کرنے پر حاصل کیا۔ سیدہ عروسہ فاطمہ دختر جناب و بیگم سید منور عالم نے کلاس نہم ۸۴ فیصد نمبر لے کر پاس کی اور اس انعام کی حقدار قرار پائیں۔ اور علینہ تملید نے اوّل کلاس میں گریڈ "A" میں پاس کی اور انعام حاصل کیا۔ تقسیم انعامات کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا ہی تھا کہ نماز مغرب کا وقت ہو گیا چنانچہ وقفہ برائے ادائے نماز کر دیا گیا۔

نماز کے بعد سلسلۂ کلام دوبارہ شروع ہوا اور مہمانان گرامی کی تواضع عشائیہ سے کی گئی۔ اس دوران جناب محمد حسن زیدی نے اپنی کہی ہوئی کئی خوبصورت نعتیں مہمانان گرامی و ممبران کی خدمت میں پیش کیں۔ جب کہ محترمہ عائشہ مسعود کالم نگار نوائے وقت نے ایک مزاحیہ نظم سنائی۔ نعتیہ کلام اور مزاحیہ نظم سے تمام شرکاء بہت محظوظ ہوئے اور کھانے کا لطف دوبالا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی تقریب کا پہلا حصہ اختتام پذیر ہو گیا۔۔۔۔

بیگم طیبہ آفتاب

''گھریلو چٹکلے''

○ **چہرے کو تروتازہ کرنے کے لیے:** اکثر بہت زیادہ محنت کرنے اور وقت پر آرام نہ کرنے کی وجہ سے چہرہ پژمردہ اور مرجھایا سا ہو جاتا ہے۔ جسے دور کرنے کے لیے کھانے کے ایک چمچ دہی میں چند قطرے سفید سرکہ کے ملا کر چہرے پر لگائیں اور پھر ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ چہرہ ایک دم فریش اور تروتازہ ہو جائے گا۔

○ **خشکی دور کرنے کے لیے:** بالوں سے خشکی دور کرنے کے لیے سر دھونے کے بعد ایک چوتھائی چمچ زیتون کے تیل میں دو قطرے لیموں کے ملا کر گیلے بالوں میں مساج کریں۔ خشکی دور ہو جائے گی اور بال خوبصورت و چمکدار ہو جائیں گے۔

○ **دانتوں میں درد ہونے کی صورت میں:** دو گلاس پانی میں میتھی کے بیج ڈال کر ابال لیں اور نیم گرم ہونے پر اس پانی سے کلیاں کریں۔ انشاء اللہ درد فوراً ہی جاتا رہے گا۔

○ **منہ میں چھالے ہو جائیں تو:** آدھا چمچ کارن فلور پانی میں گھول کر کلیاں کرنے سے چھالوں کے درد کو فوری فائدہ ہوگا۔

○ **بجلی نہ ہونے کی صورت میں گوشت محفوظ رکھنے کے لیے:** ایسی صورت میں گوشت پر آٹے کی بھوسی لگا دیں اور ایک ململ کا کپڑا سرکہ میں بھگو کر نچوڑ لیں اور گوشت کے اوپر لپیٹ دیں۔ گوشت کئی گھنٹے تک خراب نہیں ہوگا۔

○ **سانس کی تکلیف سے نجات کے لیے:** ایک چمچ پیاز کا رس پی لیں۔ انشاء اللہ فوری افاقہ ہوگا۔

○ **منہ کی خوشبو کے لیے:** رمضان شریف میں سحری ختم ہونے سے پہلے چند پودینے کے پتے، ایک منقا اور ایک چھوٹی الائچی ایک پیالی پانی میں ڈال کر ابالیں اور چھان کر وہ پانی پی لیں۔ منہ سے سارا دن مہک آتی رہے گی۔

○ **مچھلی کو مزیدار بنانے کے لیے:** مچھلی کو دھوئے بغیر اس پر نمک اور پسی ہوئی اجوائن چھڑک کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں اور پھر دھو کر مرضی کے مطابق پکائیں۔ مچھلی ذائقہ دار بنے گی کیونکہ نمک قتلوں کے اندر تک سرایت کر جائے گا۔

○ **وزن کم کرنے کے لیے:** فوری وزن کم کرنا ہو تو چند دانے سفید چنے کے رات کو بھگو دیں اور صبح نہار منہ کھالیں اور اس کا پانی پی لیں۔

○ **خراب مسوڑھوں کے لیے:** اگر مسوڑھے خراب ہوں اور سوجن بھی ہو تو سونٹھ، نمک، کالی مرچ، گیرو اور خشک تمبا کو ہم وزن لے کر پیس لیں اور اس منجن سے مسوڑھوں اور دانتوں کی صفائی کریں۔ انشاء اللہ جلد ہی تکلیف جاتی رہے گی۔ اس کے علاوہ ٹماٹر، آلو، ہری مرچ، مٹر اور گوبھی کو سلاد کے پتوں کے ساتھ شامل کر کے کھانے سے مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں۔ کینو کے رس کا استعمال بھی اس کے لیے بہترین ہے۔

○ **کینسر کے لیے:** کالا زیرہ پسا ہوا تین تین گرام دن میں تین مرتبہ کھائیں۔ انشاء اللہ مرض میں افاقہ ہوگا۔